دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارُالعُلوم

جلد: ۱۰۵	شوّال المکرّم- ذی الحجہ ۱۴۴۲ھ مطابق جون- جولائی ۲۰۲۱ء	شمارہ: ۶-۷

نگراں

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.**:** 2133/57
Vol. No. 105, Issue No. 6-7, June-July 2021 जून–जुलाई 2021
Published by Maulana Abul-Qasim Numani
Printed by Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
On Behalf of Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 40/=	Annual Subscription Rs. 200/=

Annual by Regd Post. Rs. 440/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۴۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۷۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۷۰۰ روپئے

فہرست مضامین

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو 440/= روانہ فرمائیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

حوادث کا تسلسل

محمد سلمان بجنوری

ماہ نامہ دارالعلوم کے گزشتہ شمارہ (اپریل، مئی ۲۰۲۱ء) کی اشاعت کے بعد، جس تسلسل کے ساتھ دارالعلوم دیوبند اور ملت اسلامیہ کی قیمتی شخصیات رخصت ہوئیں، اُس نے ذہن ودماغ کو ہلا کر رکھ دیا اور اہل علم ونظر، تقدیر الٰہی کی اس کارفرمائی پر راضی برضا رہنے کے باوجود فکرمند ہوگئے کہ اتنی کثرت سے باکمال اساتذہ وعلماء کا رخصت ہونا، معلوم نہیں مشیت الٰہی کے کس منشا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس عرصہ میں دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دیگر دینی اداروں کے اہم اساتذہ وذمہ داران کے علاوہ دین وملت کے مختلف میدانوں میں کام کرنے والے حضرات، نیز پڑوس کے دونوں ملکوں پاکستان اور بنگلہ دیش کے بھی نہایت اہم اور موقر علماء کرام رخصت ہوئے، ان سب حضرات کا حق ہے کہ ہم ان کا ذکرِ خیر کریں؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ صرف ناموں کا ذکر بھی کئی صفحات کا متقاضی ہے اس لیے فی الحال صرف متعلقین دارالعلوم کے تذکرہ پر اکتفاء کرتے ہیں اور تمام رخصت ہونے والے حضرات کے لیے دعاء کرتے ہیں اللہ رب العزت اُن سب کو اپنے قرب خاص سے نوازے اور ملت اور اداروں کو اُن کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

دارالعلوم دیوبند میں رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ اور اس کے قریبی زمانے میں بعض دفتری کارکنان اور شعبہ فارسی کے جواں سال استاذ مولانا محمد قاسم میرٹھی رحمہ اللہ کے علاوہ تین ایسے حضرات کی وفات کے حوادث پیش آئے جن سے دارالعلوم دیوبند اور تمام علمی حلقے متاثر ہوئے، سب سے پہلے حضرت مولانا نور عالم خلیل الامینی نور اللہ مرقدہٗ، پھر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نور اللہ مرقدہ اور پھر حضرت مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری نور اللہ مرقدہٗ، یہ تینوں حضرات

دارالعلوم دیوبند کے نہایت موقر اور کبار اساتذہ میں سے تھے، جن سے محرومی کا غم ہر طبقے اور ہر فرد نے محسوس کیا۔

ان حضرات کا حق تھا کہ ماہ نامہ دارالعلوم کے صفحات پر اُن کا تفصیلی ذکر خیر آئے؛ چنانچہ مضامین جمع کرنے کا کام شروع ہوا، مضامین ملنے میں تاخیر کی وجہ سے یہ سوچا گیا کہ تمام حضرات پر کئی ماہ کا مشترکہ شمارہ شائع کیا جائے؛ چنانچہ اسی انداز پر تیاری شروع کردی گئی۔

ابھی یہ کام جاری ہی تھا کہ ۱۹/ذی الحجہ۱۴۴۲ھ مطابق ۳۰/جولائی ۲۰۲۱ء کو حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی رحمہ اللہ کی وفات کا حادثہ پیش آگیا۔ اب یہ خیال ہوا کہ چاروں شخصیات سے متعلق مضامین پر مشتمل پانچ ماہ کا شمارہ شائع کیا جائے؛ لیکن محکمہ ڈاک سے رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس میں مصارف ڈاک کئی گنا زیادہ ہوجائیں گے، اس لیے اُس ترتیب کو بدلنا پڑا۔

اب ترتیب اس طرح ہے کہ ماہ جون وجولائی کا شمارہ حضرت مولانا نور عالم صاحب رحمہ اللہ سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے، اس کے بعد اگست کا شمارہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ سے متعلق ہے، پھر ماہ ستمبر کا شمارہ حضرت مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری رحمہ اللہ سے منسوب ہے اور ماہ اکتوبر کا شمارہ حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی رحمہ اللہ سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے؛ البتہ اُس میں چند مضامین دیگر تینوں حضرات سے متعلق بھی ہیں جو گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے ان حضرات کے خصوصی شماروں میں شامل نہیں ہوسکے۔

ان شخصیات سے متعلق بعض مضامین اب بھی باقی رہ گئے ہیں جو آئندہ اشاعتوں میں حسب سہولت شائع کیے جائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا نور عالم خلیل الامینیؒ

زیر نظر شمارہ، حضرت مولانا نور عالم خلیل الامینی نور اللہ مرقدہ سے متعلق ہے اور مضامین کی کثرت کی وجہ سے راقم سطور حضرت کے بارے میں اپنے تفصیلی تاثرات پیش کرنے کی گنجائش نہیں پارہاہے، ان شاء اللہ جلد ہی اس کی تلافی کی کوشش کرے گا۔

سر دست چند جملوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں اگر صرف اپنی انتھک محنت سے عظمت ورفعت کی بلندیوں پر پہنچنے کا کوئی نمونہ دیکھنا ہو تو حضرت مولانا کی شخصیت اس کا بہترین مصداق ہے۔ وہ ساری زندگی جس طرح شمع علم وادب پر متاعِ جاں لُٹاتے رہے اور عربیت کے

فن پاروں کی تیاری کے لیے اپنے جسم ناتواں کو گھلاتے رہے، اس کی دوسری کوئی مثال کم از کم ہمارے علم میں تو موجودہ وقت میں نہیں ہے۔ مجلّہ ''الداعی'' اُن کے قلم کی ضیاباریوں سے جس طرح چمکتا رہا اور عالمی سطح پر اپنی پہچان بناتا رہا وہ دنیا کے سامنے ہے، انھوں نے اردو اور عربی میں جو تحریری سرمایہ عطا کیا وہ اُن کے لیے پسِ مرگ زندہ رہنے کی ضمانت وبشارت ہے، اپنے اسباق کے ذریعہ انھوں نے اپنے شاگردوں کے دلوں میں (جن میں یہ طالب علم بھی شامل ہے) علم وادب کی جوت جس طرح جگائی اس کا اندازہ آنے والے مضامین سے آپ لگا سکتے ہیں، وہ دارالعلوم دیوبند کے عاشق زار تھے، دیوبند اور اکابر دیوبند کا تذکرہ آنے پر وہ جس طرح ''بلبل ہزارداستان'' کا نمونہ بن جاتے اُس کا نمونہ مشکل سے ملے گا۔

راقم اپنے گریہ کناں قلم کو مجبوراً یہیں روکتا ہے، کوشش ہوگی کہ اس اجمال کی کچھ تفصیل اپنے مشاہدات کی روشنی میں آئندہ پیش کردی جائے۔

❁ ❁ ❁

باکمال ادیب، پُر وقار شخصیت

از: حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم

۲۰ر رمضان المبارک کی صبح صادق اپنے ساتھ ایک انتہائی الم ناک خبر لے کر آئی، یعنی دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز استاذ، صاحب طرز ادیب، عربی زبان کے منفرد انداز بیان کے مالک، الداعی کے ایڈیٹر اور عربی ادب کے استاذ جناب مولانا نور عالم خلیل امینی ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے، دارالعلوم دیوبند کے تمام اساتذہ، طلبہ، متعلقین، محبین، فضلاء اور خاص طور سے مولانا مرحوم کے تلامذہ اور اہل خانہ و متعلقین سخت صدمہ اور الم کا شکار ہیں، گذشتہ سال ۲۵ر رمضان المبارک کو دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین و شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ ممبئی میں وفات پاکر دنیا سے رخصت ہو گئے، ابھی ایک سال مکمل نہیں ہوا تھا کہ دارالعلوم کے لیے یہ دوسرا عظیم حادثہ پیش آ گیا۔

مختصر تعارف

مولانا نور عالم صاحب کے سلسلہ میں کسی تعارف کی ضرورت نہیں، وہ اپنی خصوصیات، اپنی صلاحیت اور اپنی خدمات کے اعتبار سے ایک معروف و متعارف شخصیت کے مالک تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں میرا تعلیم کا آخری سال تھا، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸ھ میرا دارالافتاء کا سال تھا، اس سال استاذ محترم حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ کے یہاں صف ابتدائی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جن طلبہ کی درخواستیں موصول ہوئیں ان کی تعداد اسّی تھی، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب نور اللہ مرقدہ نے ذمہ داران کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد یہ ترتیب بنائی کہ صف ابتدائی کے طلبہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، چالیس چالیس طلباء کی دو جماعتیں بنادی جائیں، ایک جماعت کو حضرت مولانا خود پڑھائیں گے اور ایک کو حضرت کے تلامذہ میں سے کوئی ایک حضرت کی نگرانی میں پڑھائے گا۔

یہ سعادت اس ناکارہ کے حصہ میں آئی، حقیقی استاذ تو حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب نوراللہ مرقدہ تھے، ان کی نگرانی اوران کی ہدایت کے مطابق انھیں کے انداز پر ایک سبق اس بندہ کے حوالہ ہوا اور چالیس طلبہ اس کے اندر شریک ہوئے، ان چالیس طلبہ میں مولانا نورعالم صاحب خلیل امینی بھی شامل تھے، جونورعالم مظفرپوری کے نام سے داخل ہوئے تھے، مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ وہ ان کا عربی کا کون سا سال تھا۔

چوں کہ وہ میرا تعلیم کا آخری سال تھا، اس لیے مجھے ان کی آگے کی تعلیم کے مراحل کا بالمشافہ علم نہیں؛ لیکن اس ایک سال کے عرصہ میں ان کی دلچسپی، شوق، لگن اور صلاحیت کا جواندازہ ہوا اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ آگے چل کر یہ نمایاں شخصیت بن کر ابھریں گے۔

مولانا اوران کے رفقاء درس کا نمایاں مقام

صاف ستھرا انداز تحریر، عمدہ نستعلیق، انداز گفتگو اور بہت جلد اخذ اور نقل کی صلاحیت تھی، اس سال جو طلبہ اس جماعت میں شامل تھے ان میں مولانا نوراعلم صاحب خلیل امینی کے علاوہ مولانا نثار احمد بستوی جو چند مہینے پہلے دارالعلوم بستی کے اندر شیخ الحدیث وصدر مدرس تھے اور انتقال کرگئے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب بلندشہری (سابق استاذ جامعہ دارالعلوم دیوبند) مولانا نیاز احمد فاروقی دفتر جمعیت علماء ہند، یہ سارے اس جماعت کے طلبہ تھے جو سب ہی آگے چل کر ماشاء اللہ کسی نہ کسی اعتبار سے نمایاں ہوئے۔

اور اب ادھر دارالعلوم دیوبند میں میرے مستقل قیام کے بعد سے اساتذۂ کرام کے ساتھ اور خاص طور سے درجہ علیا کے اساتذہ کے ساتھ بار بار مشاورت کی نوبت آتی تھی، اس میں مولانا نورعالم صاحب بھی شریک ہوتے تھے، ان کی اصابت رائے اور تدبر اور دور اندیشی سے میں بہرحال متاثر تھا۔

مولانا کی خصوصیات

مولانا کی چند خصوصیات جن کو تمام اہل تعلق نمایاں طور پر محسوس کرتے ہیں ان میں سب سے بڑھ کر عربی زبان وادب کے ساتھ ان کی وابستگی اور اپنا منفرد انداز تحریر ہے جو ان کی ادارتی تحریر میں بھی نمایاں ہوتا تھا اور مستقل جو ان کی تصانیف ہیں یا اکابر کی سوانح عمری اوران کے مضامین کے عربی تراجم، اُن کے اندر ان کا انداز نمایاں ہوتا تھا، خاص طور پر ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی مضمون کو منتقل کرنے میں اگر یہ محسوس ہو کہ یہ ترجمہ ہے تو یہ ترجمہ کے عمل میں ایک طرح کا نقص سمجھا جاتا ہے، مولانا نے کئی اہم کتابوں کا بھی اور مضامین کا بھی ترجمہ کیا؛ لیکن وہ سارے تراجم ایسے انداز

سے لکھے گئے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ اردو زبان سے عربی زبان کے اندر منتقل کی ہوئی تحریر ہے؛ بلکہ ارتجالاً جس طرح کی تحریر ہوتی ہے اس طرح کی تحریر محسوس ہوتی تھی۔

خاص طور پر الداعی میں مولانا نور عالم صاحب کا اداریہ اور اس کا آخری صفحہ اشراقہ عربی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے ملکی اور غیر ملکی قارئین کے اندر بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا جاتا تھا۔

عربی اور اردو ادب کے اندر مہارت

مولانا آج ہمارے درمیان نہیں رہے، ان کی تحریریں، ان کی تصانیف بہر حال ان کی یاد دلاتی رہیں گی، یہ تو ان کی عربی زبان وادب سے وابستگی کا تذکرہ ہوا، ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص دو زبان میں یکساں قادر الکلام ہو، تقریر وتحریر کا اس کو ملکہ حاصل ہو، مولانا کی عربی ادب میں جو خدمات ہیں، ان کا جو مقام ومرتبہ ہے وہ تو معروف ہے ہی، اس کے ساتھ اردو زبان کے بھی وہ اچھے خاصے ادیب تھے اور ادب کی تمام نزاکتوں سے واقف تھے، اسلوب تحریر، رموز املا، جملوں کی ترتیب، کسی مضمون کو مرتب کرنے سے پہلے اس کی تیاری اور پھر اپنی معلومات کو سلیقہ سے مرتب کرنا، یہ ساری کی ساری چیزیں ان کے پیش نظر رہتی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند میں قائم شعبۂ تحقیق وتالیف اور اس سے وابستہ اساتذہ اور سرپرستوں کی چند مہینہ پہلے دارالعلوم کے مہمان خانہ میں ایک میٹنگ ہوئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ کام سے لگنے والوں کے درمیان کچھ مذاکرہ ہوجائے، اس موقع پر مولانا نور عالم صاحب نے حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری کی گفتگو کی تکمیل کرتے ہوئے مضمون نگاری سے متعلق مطالعہ، یادداشت کو محفوظ رکھنا، پھر اس کو مرتب کرنا ان امور سے متعلق بہت بہترین ہدایتیں پیش فرمائیں۔

وقار وتمکنت

مولانا نور عالم صاحب کی خصوصیات میں ان کا وقار وتمکنت بہت ہی ضرب المثل قسم کا تھا، مولانا کو میں نے تقریباً دس سال کے عرصہ میں کبھی مکمل لباس کے بغیر نہیں دیکھا، شیروانی، چھڑی اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ مجلس میں ہمیشہ تشریف لاتے اور میں نے ان میں جو ایک بات محسوس کی وہ یہ کہ دار الاہتمام میں کسی مشورہ کے لیے جو وقت متعین کیا جاتا تھا بالکل وقت کی پابندی کے ساتھ تشریف لانے والوں میں مولانا نور عالم صاحبؒ اور مولانا نعمت اللہ صاحب دامت برکاتہم مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں، صرف ایک بار جب مولانا مجیب اللہ صاحب گونڈوی دامت برکاتہم کے صا□ادے کا ناگپور میں انتقال ہوگیا اور ان کی نعش وہاں سے لائی جارہی تھی، اساتذۂ

دارالعلوم مولانا مجیب اللہ صاحب کے مکان افریقی منزل قدیم میں اکٹھا تھے، مولانا نورعالم صاحب کا مکان چوں کہ مولانا مجیب اللہ صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا ہے، اس وقت وہ صرف کرتا پائجامہ اور ٹوپی کے ساتھ کمرہ میں تشریف لائے، وہ ایک تعزیت اور غم کی مجلس تھی، مجھے یاد نہیں ہے کہ اس کے علاوہ میں نے گرمی، سردی، برسات، سفر، حضر میں کبھی بھی ان کے اپنے مخصوص لباس کے بغیر ان کو دیکھا ہو، یہ ان کی وضع داری کی بات ہے۔

گفتگو کا سلیقہ

گفتگو میں ایک سلیقہ تھا، ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے، سوچ سمجھ کر بات کرتے تھے، بلا ضرورت گفتگو سے پرہیز کرتے تھے، اپنے تلامذہ کو انھوں نے جس انداز سے تیار کیا اور ماشاء اللہ ان میں اچھی خاصی تعداد ان فضلاء کی تیار ہوچکی ہے کہ جو عربی زبان وادب کے اندر مہارت رکھتے ہیں، اگرچہ استاذ کا مقام بہرحال استاذ کا ہوتا ہے اور جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ صاحب خصوصیات کے ساتھ رخصت ہوجاتی ہیں؛ لیکن جس طرح حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب نوراللہ مرقدہ نے اپنے پیچھے اپنے تلامذہ کی ایک جماعت چھوڑی تھی، جن میں خود مولانا نورعالم صاحب خلیل امینی بھی شامل تھے، اسی طرح مولانا نورعالم صاحب نے بھی اپنے پیچھے اپنے تلامذہ کی ایک جماعت چھوڑی ہے، جو مختلف اداروں میں اور مدارس میں خدمات انجام دے رہے ہیں، تقریر وتحریر دونوں میدانوں میں کام کررہے ہیں۔

باقیات صالحات

مولانا نورعالم صاحب کی عربی تحریروں کے علاوہ ان کی اردو تصانیف بھی بعض بہت اہم عنوانات پر مشتمل ہیں، قضیہ فلسطین ہے، اسی طرح اردو مضمون نویسی اور رموز املاء پر ان کی کتابیں ہیں، عربی کے تمام خطوط کی تعلیم کے لیے جو کتاب مرتب کی ہے جس میں خط نستعلیق، خط رقعہ، خط دیوانی وغیرہ کے تمام نمونے دیے ہیں یہ سب ان کے باقیات صالحات ہیں جو ان کے بعد ان کی یاد کو باقی رکھیں گے اور ان شاء اللہ ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنیں گے۔

اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، ان کے تمام اہل خانہ، پسماندگان، اہل خاندان، اہل تعلق، تلامذہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، دنیا میں ہر شخص جانے کے لیے ہی آیا ہے؛ مگر کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جن کے حادثۂ وفات کو مدت تک بھلایا نہیں جاسکتا، اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند کی بھی حفاظت فرمائے!

❀ ❀ ❀

نورِ درخشاں

مفکرِ عصر، ادیبِ زماں، استاذِ دوراں، اتالیقِ وقت، عندلیبِ دارالعلوم

حضرت مولانا نورعالم خلیل امینی رحمہ اللہ

استاذ ادبِ عربی ورئیس تحریر "الداعی" دارالعلوم دیوبند

۱۳۷۲ھ ۱۹۵۲ء - ۱۴۴۲ھ ۲۰۲۱ء

ذوقِ خامہ: مولانا محمد فہیم الدین بجنوری
خادمِ تدریس دارالعلوم دیوبند

سدا رکھتا ہوں شوق اس کے سخن کا
ہمیشہ تشنۂ آبِ بقا ہوں
(ولی)

استاذِ گرامی، حضرت مولانا نورعالم خلیل امینی علیہ الرحمہ، تکمیل ادب میں، فقط ایک گھنٹہ رو بہ رو ہوتے تھے؛ لیکن ذہنوں میں چوبیس گھنٹے رہتے تھے، ساعتِ ششم کا تصور اعصاب پر صبح سے حاوی ہوجاتا تھا، طبیعت میں سحرکاری وجادوگری جو تھی! آپ عہدِ ثانی کی ان چنیدہ اور کلیدی شخصیات میں ہیں، جنھوں نے دارالعلوم کی فضاؤں کو اپنا رنگ وآہنگ دیا، جن کے طبع زاد اوراق نے، یہاں کے عندلیبوں، گلوں اور لالہ ہائے گل زار کو، نئے زاویے سے فیض یاب کیا، وہ مدرس نہیں نقاش تھے، اسیرانِ نو، دل کے ہارنے کا خوش گوار تجربہ، روزِ اول کرتے تھے، اولین صحبت میں قلوب کی جو تختیاں، ان کے اختیار میں آتی تھیں، ان پر تصرف میں وہ سال بھر، ہر طرح آزاد ہوتے تھے۔

آپ کے تیار کردہ جام وسبو اور شیشہ وساغر کا ذکر نہ چھیڑ اے ہم نشیں! اُس بزم میں، زبان وسخن کی داستان تھی اور اس کی نت نئی انگڑائیاں بھی، ادب تھا اور اس کی نزاکتیں بھی، فکر وشعور کے جلوے تھے اور تخلیق وفن کی رعنائیاں بھی، علم وآگہی کے حسین نظارے تھے اور طلب وجستجو کے ذوق کی ضمانتیں بھی، عشقِ اکابر کی آتش فروزاں کرنے والی انگیٹھی کے لیے بھی، وقت اور دن کی کوئی قید وبندش نہیں تھی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور دیگر بزرگوں کا، رس گھولنے والا ذکر، کسی بھی دن دراز

ہوجاتا تھا،غرض! اُس ''دوکان'' میں آخر کیانہیں تھا! لیکن آج صد حیف کہ:

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل
وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

طیبہ کی مئے مرغوب اور ہندوستان کا سفال وظرف

فخرِ زبان وادب، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے کہا تھا:

''اس دنیا میں ہر شخص، کسی نہ کسی تصویر میں، اپنا خدا دریافت کرہی لیتا ہے، بابائے اردو، مولوی عبدالحق کو، اردو زبان کی صورت میں خدامل گیا ہے۔''

مولوی عبدالحق کو اردو زبان کے ساتھ جو عشق وجنون تھا؛ یہ اس کی بھرپور تمثیل ہے، استاذِ گرامی حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ سے منسوب'' کارزارِ حیات'' ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ انھوں نے بھی کسی حال ووجد میں، عربی زبان کی جاں نثاری وفدا کاری کا حلف اٹھالیا تھا اور پھر اپنے استاذِ خاص، حضرت مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ کے دست مبارک پر کیے گئے، اس عہد و پیمان کو، جہانِ آب وگل سے عالمِ جاوید تک نبھایا۔

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کو سفالِ ہندی پر حد درجہ اصرار تھا، اس اصرار کی بنیادیں دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا وحید الزماں کے ساتھ اتاہ عشق میں تھیں، آپ نے سعودی عرب میں، عربی زبان کا ایک مختصر المیعاد کورس کیا تھا، جب آپ کی عربیت کے کوکبہ، جلال نے، عالمِ عرب کو خیرہ کیا، تو نسبت کے تئیں فکر دامن گیر ہوئی، آپ اس تصور سے ملول ہوجاتے کہ ان کے فن پاروں کو، مذکورہ کورس کا احسان مند گردانا جائے گا، جو کہ ان کے نزدیک، دارالعلوم دیوبند اور مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ کے فیوض والطاف سے سخت بے رخی وناسپاسی تھی، مجھے یاد نہیں ہے کہ اس باب کی صفائی، میں نے آپ سے کتنی بار سنی ہے، اس سیاق میں آپ پر جوش ہوجاتے تھے، رگیں پھول جاتی تھیں اور آواز بلند ہوجاتی تھی، پھر غیرت آپ کو یہ کہنے پر مجبور کرتی تھی کہ میرے پاس جو کچھ ہے، دارالعلوم کی دین ہے، مجھے جو کچھ ملا ہے، حضرت مولانا وحید الزماں سے ملا ہے اور بس!۔

خِرَد وآگہی کے مضر اثرات

خِرَد کا زہر، عدم! موت ہے جوانی کی
وہ خوش نصیب ہے جو مردِ ہوش مند نہیں

(عبدالحمید عدم)

علمی وفکری کامیابیوں کا خون بہا، ہمیشہ مہنگا رہا ہے؛ بل کہ بیشتر جان لیوا بھی؛ آپ اس شوق کو دھیمے زہر سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، تکمیل ادب کے شب و روز کی ہمہ ہمی کے بعد، سن ۲۰۰۰ء میں تخصص فی الادب کی تقریب سے، بندہ حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کے نزدیک آیا، پچاس کے لپیٹ سے باہر نہیں تھے؛ لیکن عوارضِ صحت، آپ کے عزائم اور خاکوں میں مزاحم ہو چکے تھے، ہم نے پہلی بار شگر کے عارضے کو نزدیک سے دیکھا اور سمجھا، جو پہلے ہی آپ کی صحت وتوانائی کے ساتھ، ہلاکت خیز مفاہمت کر چکا تھی۔

لسانِ نبوت سے کیا بات نکلی ہے کہ ''علم کا شیدائی سیراب نہیں ہوتا'' (ترمذی، حاکم)! متنبّی نے عاشق کی نفسیات خوب سمجھا ہے:

العشق كالمعشوق يعذب قربه
للمبتلي وينال من حوبائه

عشق واقع میں جاں گسل ہے، تو ہوا کرے! عاشق کے ذوق میں، وہ ہزار قند ہے، نیز دیسی محاورہ یوں ہے:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے بیٹے سے دوا لیتے ہیں

میں نے وہ آنکھیں دیکھیں، جن کی روشنی، علم کی راہ نوردی کے نام ہو چکی تھی، گہرے چشمے سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں، کتب بینی اور مطالعے کے بے رحم ردِ عمل کی شکایتیں عیاں تھیں، وہ اعصاب دیکھے، جن کو فکری معرکہ آرائی نے ماندہ کر دیا تھا، بالیقین لرزتی ہوئی انگلیوں نے، رعشہ آشنا ہونے سے قبل، تخلیق وفن کا دراز تر سفر طے کیا تھا۔

شمع علم کے پروانوں کی روایات کو آپ نے تسلسل دیا، لطفِ زندگی سے سمجھوتہ کیا اور خونِ جگر کو علم وفکر کے گلزاروں کی آب یاری کے لیے بچا کر رکھا، بامرادی کی اس کلید کا ادراک، آپ کو عنفوانِ شباب سے تھا؛ تازہ جواہر پاروں کی نسبت کچھ کہنا، تو یقیناً مدحِ آفتاب ہے؛ تاہم حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کے پچاس سالہ قدیم مضامین بھی میری نظر سے گذرے ہیں، وہی جلوہ، وہی رعنائی، وہی حسن، وہی دادِ زبان وسخن اور فکر وفن!

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی دو ذاتی لائبریریاں تھیں، فارسی خانے سے متصل دار جدید کے گوشے والا حصہ کافی کشادہ تھا، کچن کے علاوہ بھی اس میں دو بڑے کمرے تھے، کتابوں سے مملو یہ

کمرے آپ کے ذوق مطالعہ کے گواہ تھے؛لیکن یہ وسیع رقبہ بھی آپ کے ذخیرۂ کتب کے لیے کوتاہ دامنی کا شاکی تھا؛اس لیے آپ نے خصوصی گزارش کے ذریعے، دولت کدے کے اوپر ایک وسیع کمرہ تعمیر کرایا، جو کتابوں کی کان بنا، مجھے ان دونوں لائبریریوں کی خدمت کا موقع ملا، وہاں موجود کتابیں آپ کی شخصیت کے گونا گوں شاندار گوشوں کے تئیں چشم کشاں تھیں، ان کتب خانوں کے مشمولات میں،اس رائے عامہ کی پیہم تغلیط تھی کہ حضرت صرف ادیب اور زبان داں ہیں۔

فن بلاغت میں دستر خوان کی صفائی، بخل کی عمدہ تمثیل مانی گئی ہے، بخیل کا دستر خوان میلا کیوں کر ہوسکتا ہے، جب استعمال کی نوبت ہی نہیں آتی، بندے نے کتابوں کو بھی اسی زاویے سے دیکھا ہے، الماریوں میں قرینے سے سجی ہوئی کتابیں، بہتوں کے یہاں دیکھیں؛ لیکن ہم اس وقت تک سیرچشم نہیں ہوتے؛ جب تک کتابوں کا انبوہ، نشستِ مطالعہ پر بالیدہ وپراگندہ نہ ہو، ہمارا یہ ذہن حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی مطالعہ گاہ نے بنایا ہے، آپ کے بیرونی کمرے میں، کتابوں کا بے ترتیب پھیلاؤ، کسی وارد وصادر کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

منفرد طریقِ کشید اور اس کی افادیت پر ایمانِ راسخ

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے
(فیض احمد فیض)

آپ کے محبوب استاذ، وحید العصر، حضرت مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ، بابِ تعلیم میں کیفیت کے قائل تھے، کمیت کا درجہ ان کے نزدیک ثانوی تھا، زبان ولغت کے گونا گوں روابط سے، انھوں نے یہ کشید کیا تھا کہ لفظ ہو یا تعبیر، اس کا مجرد مواجہہ کوئی شے نہیں ہے؛ ایسی شاہانہ سیر کے ساتھ، جملہ عربی دفاتر بھی آپ کو کچھ نہیں دے سکتے؛اس کے برخلاف آپ ایک لفظ سے ملیں؛مگر اس پر خیمہ زن ہوجائیں، یہ ہزار قراءتوں سے افضل، مؤثر، مفید اور نتیجہ خیز ہے۔

حضرت الاستاذ، مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ نے ہمیں بتایا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں، اسباق کے انبار نہیں تھے، ان کے ذوق میں "**ماجد حضر في الفصل**"ایک یوم کے سبق کی طرف سے کفایت کرسکتا تھا، ان کے نزدیک یہ ایک جملہ مکمل عربی زبان کی تعلیم کا سفیر تھا، معلم کو یقیناً تفہیم سے فارغ ہونا ہے؛لیکن متعلّم اس نوع کا کوئی خیال ہرگز نہ پالے، یہاں سے اسی کے حصے کا کردار شروع ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ''ماجد'' کی تبدیلی میں، آپ اپنے حافظے سے کتنے اسما فراہم کرسکتے ہیں؟ ''حضر'' کی جگہ افعال کی کتنی شکلیں، صیغیں اور گردانیں استعمال کرسکتے ہیں؟ ''الفصل'' کے متبادل کے طور پر، کائنات کی کتنی چیزوں کو آپ ظرف بنا سکتے ہیں؟ پھر اس جملے سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے، آپ کے پاس توانائی کتنی ہے؟ نیز اس قواعد کے لیے، اپنی حیاتِ عزیز سے، کتنی ساعتیں، پہر اور ایام مستعار لے سکتے ہیں؟ ان سوالوں کے جواب طے کریں گے کہ عربی زبان سیکھنے کی راہ میں، کامیابی کے کتنے مدارج، آپ کا مقدر بن سکتے ہیں۔

حضرت الاستاذ خود بھی نہج وطریق کے بادشاہ تھے، اس میں ان کے اپنے اضافے ہیں، دل چسپ بھی اور البیلے بھی، ان کے یہاں الفاظ اور تعبیرات سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے، ''پوسٹ مارٹم'' کا لفظ خوب آتا تھا، وہ کہتے تھے کہ ہماری گھڑیوں میں بارہ گھنٹے ہوتے ہیں، ریلوے میں چوبیس، تم اپنی مشق میں اڑتالیس گھنٹے بجاؤ، لفظ وتعبیر میں تصرف کرتے جاؤ؛ تا آں کہ وہ دست بستہ طالبِ پناہ ہو اور آپ کی کتاب کا جز بننے پر شرم سار وغم خوار! اس مشغلے کو نشست وبرخواست اور آمد ورفت کا ایسا جز بناؤ کہ دیکھنے والوں کو خلل داغ کا گمان ہو۔

اپنے استاذ کے طریقِ تدریس کے حوالے سے، وہ مسلکِ توحید رکھتے تھے، اس کی افادیت ان کے یہاں ایمان کی طرح راسخ تھی، اس کے امتیاز کو ظاہر کرنے کے لیے فرماتے تھے کہ اگر وقت کا شیخ الحدیث بھی، عربی سیکھنے کے لیے آئے گا، تو اس کے لیے بھی یہی واحد راستہ ہے، اس کو بھی ''حضر ماجد في الفصل'' سے اسی طرح الجھنا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

طبع زاد لطائف کا چشمۂ شیریں

لبوں پر تبسم، تو آنکھوں میں آنسو، تھی دھوپ اک پل، تو اک پل میں بارش
ہمیں یاد ہے باتوں باتوں میں ان کا، ہنسانا رلانا، رلانا ہنسانا

(اکبر حیدرآبادی)

بے شک تدریس، ایک سنجیدہ پیشہ ہے؛ لیکن درازنفس سنجیدگی، گرانی کا موجب ہے، طبیعت پژمردہ ہوجاتی ہے اور اخذ واستفادے کے لیے درکار، انبساط وانشراح باقی نہیں رہتا؛ کام یاب تدریس کے لیے، صورتِ دل گیر اور شگفتہ تصویر؛ دونوں یکساں طور پر مطلوب ہیں، ہم نے یہ دو متضاد جوہر، اپنی کامل شکل میں، دو اساتذہ کے یہاں جلوہ گر دیکھے، امام التدریس حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری علیہ الرحمہ، ماحول کو ہمہ تن جستجو، سنجیدہ اور متفکر رکھتے تھے؛ پھر اسی لمحہ خوراک تبدیل کرتے اور

اپنے آزاد لطائف سے، فضا کو زعفران زار کردیتے تھے، اس فن کاری کے دوسرے بادشاہ، حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ تھے، اس سلسلے میں، حضرت ادیبِ زماں کو، اول الذکر سے یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپ کے بیشتر لطائف خانہ زاد تھے، گویا اس باب میں بھی، ان کی تخلیق خو طبیعت کو، چراغِ دیگر، مستعار لینے میں ابا تھا۔

امامِ ادب وسخن کی درس گاہ، متانت وسنجیدگی کی مثال تھی، تلامذہ حد درجہ مرعوب وخائف رہتے تھے، پیاس کی مد میں، میز پر رکھا بھاری بھرکم گلاس، تنبیہ الغافلین بننے کا امکان، ہمہ وقت رکھتا تھا، وقفے وقفے سے اس کی تصریح، خطرے کو یقینی بناتی تھی؛ گو کہ اس نے واقعے کی شکل اختیار کبھی نہیں کی، پھر یہ ماتم کدہ، اگلی ہی ساعت، بزم آرائی کا منظر بھی پیش کرتا تھا، کوئی خارجی لطیفہ فراہم نہ ہوتا، تو حاضرین میں سے کسی کے کوائف، سامانِ شگفتگی پیدا کرتے۔

کاہل اور بے ہنگم ساخت کے طلبہ کا مستقبل ان کو اہتمام میں نظر آتا تھا، ''لاعلاج مریضوں'' کی تشخیص میں فرماتے کہ انھوں نے کچھ نہ سیکھنے کا حلف اٹھایا ہے، ان کے احوال کی ترجمانی میں یہ دو عہد وپیمان دہراتے تھے: ''ہم کورے آئے تھے اور کورے ہی واپس ہوں گے''، نیز: ''ہے کوئی مائی کا لال جو ہمیں ایک حرف بھی سکھادے؟''۔

چھوٹی اور دبلی کاپیوں کے لیے، ان کے یہاں ''زیر جامہ لباس'' کی تعبیر تھی، خراب خط کا نام ''کیڑن مکوڑن'' رکھا تھا، کبھی نام کی ایجاد کا اختیار بھی دیتے تھے، فرماتے: جب اتنا بُرا لکھا ہے، تو اس کا نام بھی تجویز کرو، غیر معیاری مدارس، ''صفر سرمایہ کاری کارخانے'' کے زمرے میں تھے، جن میں ثمر آوری یقینی اور خسارہ ناممکن، مزاح سے مغلوب ہوتے، تو اپنے علاقے کی تہذیب کو بھی لیتے، اپنے ہم وطن طالب علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، مجھ سے گویا ہوئے کہ ان کے یہاں بھینس بھی ''آتے ہیں''، میرے وطن بجنور کو کوفہ قرار دیا تھا، مجھے چھیڑنے کے لیے، دوسرے حاضرین کو میرے وطنی انتساب پر متنبہ کرتے، ایک علاقے کی نفسیات کے حوالے سے فرمایا کہ ان کو نوکری اور ملازمت چاہیے، خواہ جہنم کی ہو۔

میں ایک سنجیدہ مزاج، ذی علم، دینی شخصیت کے ساتھ حاضر ہوا، جن کے علمی ودینی مقام کے حضرت خود بھی بہت قائل تھے، اتفاق کی بات کہ ان کا جسم بھی بھاری تھا اور ان کے دو دیگر تلامذہ بھی کھاتے پیتے تھے، اِدھر میرا وزن بھی سوا ہے، گویا حیات بخش موضوع ہم رشتہ تھا؛ چناں چہ ملاقات کا اصل موضوع جو کہ نہایت اہم تھا، پس منظر میں چلا گیا اور حضرت نے منظر نامے کے ساتھ دل بھر کر

شوخی کی۔

تلاوتِ قرآن کے بڑھے ہوئے شغف میں، جنت کے اُس پار نکلنے کا امکان، جو ان کو دریافت ہوا تھا، وہ احاطہ، دارالعلوم کو ایک عرصے سے گل زار کیے ہوئے ہے، تیز رفتار بائک والے کی نسبت، ان کو دنیا کے آخر تک نکل جانے کا گمان ہوتا تھا، رجسٹر حاضری کی غیر معیاری تحریر میں، اردو شرح کے مواقع تلاش کرتے تھے، نورانی قاعدے میں اردو شرح کی ضرورت کو اجاگر کرتے ہوئے، نام بھی منتخب فرمایا تھا: ''روحانی فائدہ شرح اردو نورانی قاعدہ''، شرح نویسی کے محرک اعذار سے متعلق، جھوٹی داستان کی چٹکی لیتے ہوئے فرماتے کہ آں موصوف کی زحمتِ قلم نے، ایک خلق کو، ناحق مرنے سے بچالیا۔

شمع بزمِ متنبیؔ

سنتا ہے جو تمھیں، نہ سنے ہے کسی کو وہ
کیا جانے کیا سکھاؤ ہو، تم کیا پڑھاؤ ہو
(کلیم عاجز)

عربوں کے سب سے بڑے شاعر، ابوطیب متنبیؔ کا دیوان، شعری ادب کا بے نظیر ذخیرہ اور منظوم آثار کا بیش قیمت اثاثہ ہے، جو صدیوں سے اہل ذوق کے دلوں پر حکمرانی کر رہا ہے، ابن جنی، واحدی اور عکبری جیسے ائمۂ شعروسخن نے، اس دیوان کی خدمت کو اپنا سرمایہ افتخار سمجھا؛ بل کہ اول الذکر کو، خود متنبیؔ نے اپنے اشعار کا عارف اور محرم اسرار قرار دیا، کوئی طالب رجوع ہوتا، تو متنبیؔ، ابن جنی کا حوالہ دے کر کہتا کہ وہ میرے اشعار کو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔

کہنے کو برصغیر کے بیشتر دینی مدارس نے، اپنے عربی نصاب میں متنبیؔ کے لیے جگہ نکالی ہے؛ لیکن از ہر ہند میں اس کی تدریس کو نئے معانی ملے، ہماری طالب علمی میں سالِ ششم کی تین درس گاہیں تھیں، متنبیؔ کا جام تین صحبتوں کو لطف ونشاط بخشتا تھا اور اس کے تینوں ساقی ومرشد نابغۂ روزگار تھے؛ بل کہ ہنگامۂ گیر ودار کے کیف وسرور میں، تینوں ہستیوں کو اندازہ نہیں ہوا کہ ان کی داستانِ حیات نے، وسطی با سے الف اور وسطی الف سے علیا کے مدارج طے کر لیے ہیں اور اب وہ امامِ ادب وسخن، مفکر عصر حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی، یا استاذ الاساتذہ، حضرت مولانا عبدالخالق مدراسی، نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، یا جانشینِ اکابر، حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی، نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہو چکے ہیں۔

متنبیؔ کے ساغر و پیمانے کا یہ سنہرا دور، دراز تر ثابت ہوا، جس کا دورانیہ چار دہائیوں پر مشتمل ہے، مادرِعلمی کے نظامِ تعلیم میں، وقفے وقفے سے ابھرنے والی، تبدیلیِ مذاق کی لہریں بھی، اس تسلسل میں مزاحم نہ ہوسکیں، اُس وقت تین بزم تھیں؛ درس کے بنیادی تقاضوں میں آسودگی کے تئیں وہ یک رنگ تھیں؛ لیکن اضافی خصوصیات، اس کہکشاں میں تنوع پیدا کرتی تھیں، عربیت میں تعمق وتدقیق کا رجحان، شاعرانہ ذوقِ لطیف کی تعمیر، جمالیاتی مزاج وحس کی دریافت؛ یہ وہ سہ رخہ تنوع تھا، جو تینوں بزموں کو جداگانہ خدوخال سے روشناس کرتا تھا۔

تحدیث نعمت کے لیے میرے ترکش میں، اس سے بڑا کوئی تیر نہیں کہ ششم ثانیہ کی جس درس گاہ میں، حضرت علوم عربیت کے دریا بہاتے تھے، عین اسی وقت، اسی درس گاہ کے بالائی حصے میں، ششم رابعہ کے طلبہ کو مطمئن وخوش کرنے کے لیے، بندہ مختلف ترکیبیں آزماتا تھا، افسوس کہ اب یہ حسین منظر اور دل فریب احساس اپنے ماضی کو روئے گا:

وہی بزم ہے وہی دھوم ہے، وہی عاشقوں کا ہجوم ہے
ہے کمی تو بس اسی چاند کی، جو تہہِ مزار چلا گیا
(نصیرالدین نصیرؔ)

میکدۂ زبان وادب، تکمیلِ ادب، ساعتِ ششم

اس سخن ور سے مجھے فیضِ سخن ہے اے حفیظ!
نامِ نامی ہے گرامی، جس جہاں استاد کا
(حفیظ جالندھری)

درسِ نظامی کا سودا، کل وقتی عہد و پیمان ہے، دن تمام درس گاہ کی نذر، رات تکرار واعادے میں محبوس، ہمارے دور میں طالب علم کو بیرون کی کوئی خبر نہ تھی، یہاں ''قدیم الایام'' کی قید دانستہ ہے؛ کیوں کہ جب سے ''فتنۂ دست وجیب'' نے، کچے پکے گھر کو فتح کیا ہے، دانش گاہوں کی روایات بھی بدل گئی ہیں، حالیہ ربع صدی میں، قیامت کی فسوں گری دیکھنے میں آئی ہے، الغرض! اُس وقت کے احوال دیگر تھے، بیشتر طلبہ، درسی سرگرمیوں تک محدود تھے؛ اس میں خارجی مطالعہ کا بھی استثنا نہیں۔

ضابطے میں تکمیل ادب کی تپائی پر" **المختارات العربية**" رکھی ہوتی تھی، جو عربی اخبارات کے اقتباسات کا مجموعہ ہے؛ لیکن بنیادی طور پر یہ نثر جدید کا گھنٹہ تھا، معلوم ہے کہ نئے دور میں زبان کا سفر نسبتاً زیادہ تیز گام ہے، صحافتی، معاشرتی اور تہذیبی تحریکوں کے علاوہ، ٹیکنالوجی کی جادوئی ترقی

نے ،اس کی رفتار کو بے قابو کر دیا ہے،چشم زدن میں نسلوں کی خلیج کا مسئلہ منہ اٹھالیتا ہے؛ پھر یہ مجموعہ خود کئی دہائیاں دیکھ چکا تھا؛ اس لیے پڑھاتے ہوئے کسک محوس کرتے تھے، نئے انتخاب کی آرزو کسی بھی دن الفاظ کا جامہ پہن لیتی تھی،حضرت الاستاذ اگر آمادۂ اقدام ہو جاتے،تو تکمیل ادب کے نونہالوں کو زندہ،شاداب،رواں دواں اور سدا جواں چشمہ مل جاتا۔

تاہم کہانی کا دوسرا رخ بھی ہے، مجھے یاد ہے کہ قفس کے بالکل ابتدائی ایام میں،اولین صفحے پر ''اجتماع طارئ للأوبك لبحث تهديدات فورد'' جیسے متون کی قرأت ہوتی،تو جماعتوں میں ممتاز آنے والے،''مشاہیر'' کے چہروں پر ہوائیاں اڑتیں اور ان کی آنکھیں کبڈیاں کھیلتیں، تعبیرات کے توحش اور اجنبیت سے،اس کلام کی یادیں تازہ ہو جاتیں،جس کو بلاغت کے صفحات نے ، جنات کے کلام کے طور پر محفوظ کیا ہے،ان نونہالوں کی نفسیاتی کہتری اور زبان کی نئی انگڑائیوں سے بے خبری کو دیکھیں،تو میکدے کو قدیم روایات پر رکھنا بھی خیر سے خالی نہیں؛ چناں چہ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ نے،متذکرہ بالا خاکے میں رنگ بھرنے سے گریز ہی کیا۔

عربی زبان وادب کا گلزارِ وحیدی اوراس میں بہارِ امینی

صدقے اس اَبرِ فیض کے جس کی بہار نے

پُر خار وادیوں کا خیاباں بنادیا

برصغیر کے دینی مدارس، اپنے ناموں کے ساتھ''عربیہ'' کا لاحقہ لازماً لگاتے ہیں، ہمارے مدارس کی عرفی شناخت میں بھی،اس جز کی نمائندگی ہے،اس نظام کو عرفِ عام میں''عربی تعلیم'' سے بھی یاد کیا جاتا ہے؛ نام کو درکنار کریں،کام کا جائزہ بھی یاد دلاتا ہے کہ ہماری تعلیم کا انحصار عربی زبان پر ہے،قرآن وحدیث ہماری تعلیم کا مرکز ہیں؛ یہ دونوں مصادر اور ان سے پھوٹنے والے جملہ علوم کا پیرہن یہی زبان ہے،ابتدائی درجات کی ایک دو کتابوں کے استثنا کے ساتھ،نصاب بھی عربی ہے؛ لیکن اس''داستانِ امتیاز'' کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ عربی نصاب،کبھی عربی نظام میں تبدیل نہیں ہوا، مدارس کا ماحول، زبان اور تحریر دونوں میں،عربی قالب سے محرومی وعاجزی کا شاکی رہا۔

دوسری رائے والوں کی یہ توجیہ بے شک اپنے معانی رکھتی ہے کہ عربی بول چال، ہمارے مدارس کا ہدف نہیں ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نصب العین کی نسبت، ہمارے مدارس کی تاریخ، علوم دینیہ کے سلسلہ کا،سب سے درخشاں باب ہے،قرآن وسنت کے گہرے ادراک میں، وہ اپنی نظیر خود ہیں،ان کے نکالے ہوئے آب دار موتیوں نے ،اِس نبوی پیشین گوئی کو پورا کیا ہے کہ دور افتادہ

علاقوں میں، احادیث کا خیر مقدم کرنے والے، ان کے اصل ناقلین وحاملین سے، زیادہ فقیہ و سمجھ دار ہوں گے: "رُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعیٰ مِنْ سَامِعٍ" [بخاری: ۱۷٤۱]۔

لیکن یہاں دیگر پہلو بھی ہیں، جن کو متواتر نظر انداز نہیں کر سکتے، ہم نے عرب مصادر پڑھنے پر اکتفا کیا، خداداد فہم کا جادو چلا اور اکابر نے گہرائی میں جا کر نگینوں کو دریافت کیا؛ پھر ان نگینوں کو درس گاہوں میں لٹایا، تلامذہ نہال ہوئے، افادات سینہ بہ سینہ منتقل ہوئے، اردو تعلیقات کے ہم دوش برصغیر میں عام بھی ہوئے؛ لیکن علم کی داد کے جو مراکز ہیں: حجاز، شام، مصر......وہاں خبر تک نہ ہوئی، چند یواقیت جو پہنچے، وہ "مشتے نمونہ از خروارے" سے زیادہ نہ تھے؛ عربی اظہار سے نابلدی ہی، اس خسارے کی ذمے دار ہے، جس طرح فہم کا سلیقہ، پیہم فہم سے آتا ہے، اسی طرح تحریری اظہار بھی، قلمی ممارست ہی سے آتا ہے، جس کو عہد بہ عہد نظر انداز کیا گیا۔

اس پس منظر میں ہماری تاریخی تہی دامنی کو دور کرنے، گلشنِ درس نظامی کو نئی بہار سے روشناس کرانے، تازہ کرنوں کا چراغ روشن کرنے، خوش گوار انقلاب برپا کرنے، گل زار میں بادِ بہار داخل کرنے اور اس کے گلوں کو عشرت منزل بنانے، مردہ گوشے میں صور پھونکنے؛ غرض! دستور میخانہ میں، بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے، جس غیر معمولی، تاریخ ساز، عہد آفریں شخصیت کی ضرورت تھی، وہ دارالعلوم کو، جدید عربی کے ارسطو، وحید العصر، حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی علیہ الرحمہ کی شکل میں ہاتھ آ گئی۔

نیا طرز جنوں

خیرہ کیے دیتا ہے نگاہوں کو چمک کر
ہر ذرہ ہے خورشید کا شاگرد رشید آج

حضرت مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ کا شمار ان ہستیوں میں ہے، جنھوں نے تاریخ کو وجود بخشا، جدید عربی کے گلشن میں، بہارِ نو کی تاریخ، ان کی جد وجہد سے منسوب ہوئی، مادر علمی کے اربابِ انتظام کی قیافہ شناسی کو سلام! ان کے یُمنِ قدم نے چمن کو نہال کر دیا، ان کا جستجو آشنا رسا ذہن، ایک دو خاکوں پر قانع نہیں ہو سکتا تھا، منصوبوں اور خاکوں کا سیل رواں جاری ہوا، درس وتدریس کے لیے عربی صفوف کا اجرا، تحریر کے لیے دیواری پرچے، تقریر کے لے انجمن، غرض! ہر صبح نئی نسیم وصبا اور ہر شام نیا دامن باد، دیکھتے ہی دیکھتے، مادر علمی کی فضا، عربی رنگوں سے جگمگا اٹھی، زمین پہلے ہی زرخیز تھی، آب یاری ہوئی تو خزانے نکل آئے۔

رجال سازی ان کا خاص جوہر تھا،اس باب میں آپ کی کامیابی،تاریخ دیوبند کا درخشاں باب ہے،ہم ۱۹۹۷ء میں دارالعلوم آئے،تو مادرعلمی کے درودیوار پر چسپاں ''وہ کوہ کن کی بات'' کے اشتہار کو پڑھنے اور سمجھنے کی، جدوجہد کرنے والوں میں شامل ہوئے،آپ کی رحلت کو دو سال ہو چکے تھے؛ لیکن ''فرہادؔ'' نے رخت سفر باندھا،تو وہ ''کوہ کنی'' کے مقصد میں سرخ رو ہو چکا تھا،ان سے شرف تلمذ رکھنے والی عنادل، ہر چہار سو چہچہارہی تھیں، اندرونِ احاطہ بھی اور بیرونِ احاطہ بھی، اس مختصر وقفے نے ،منظر نامہ تبدیل کر دیا تھا، جو حلقے ہمیں جدید عربی کے عنوان سے طعنہ دیتے تھے، وہ ہمارے خوشہ چیں بن گئے، وحیدی داستان ایسی ہمہ گیر و ہمہ جہت تھی کہ معاصر چمن کی قمریاں بھی، ان کے اوراق چرانے اور ان کے گلوں سے، گل چینی کیے بغیر نہ رہ سکیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بازی بالکلیہ بدل گئی، لینے والے سینے، دینے والے بن گئے، دفاع کی روایات والے، اقدام کی تاریخ رقم کرنے لگے۔

تحریک زبان وادب کا آخری نقیب

عودِ ہندی بن کے پھیلی تیرے نغموں کی صدا
تو ہے شاگردِ رشید بلبلِ ہندوستاں

کیرانوی الطاف گوکہ عام تھے؛لیکن بادہ خواروں کے ظرف، وجہِ فرق کا کردار ادا کرتے ہیں، ابرِکرم ہر جگہ یکساں برستا ہے؛لیکن اجزائے ارض کا فطری تفاوت اپنا کام کرتا ہے،آپ کی صلائے عام پر لبیک کہنے والوں میں،نکتہ دانوں کا منتخب ہجوم تھا؛لیکن اس مے خانے کی جانشینی کا قرعۂ فال، استاذِ گرامی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کے نام نکلا،علم وادب کا جو انقلاب، حضرت کیرانوی علیہ الرحمہ نے متعارف کرایا تھا، اس کی آب یاری کے لیے، مالکِ نون والقلم نے آپ کو منتخب کیا تھا،تخم ریزی استاذ کر گئے تھے، بارآوری کے لیے آپ چنے گئے، کشتیِ سبک رفتار کو، تیز گامی کے لیے، جو موافق ہوا درکار تھی، وہ آپ کے دمِ گرم سے فراہم ہوئی، نئے گل کھلے، زمزمہ خواں بلبلیں تیار ہوئیں، ہر دو نگاہ فیض نے ،نسلوں کی کشتِ حرف چمکائی اور پھر انھیں افتادہ زمینوں سے خزانے برآمد ہوئے۔

ہمارے متعدد اکابر اساتذہ، حضرت کیرانوی علیہ الرحمہ کا ذکر آنے پر، گرمی جذبات، درون تک محسوس کرتے تھے؛لیکن ایک شخصیت ایسی تھی،جس میں ان کا عکس جمیل بہ چشم سر دیکھا جاسکتا تھا،استاذ وشاگرد کے مابین انتقالِ نسبت کا وہ بے نظیر حوالہ تھے، انھوں نے ''وہ کوہ کن کی بات'' میں اپنے محسن ومربی کی تصویر اتاری تھی؛لیکن وہ خود اس تصویر کے زیر وبم میں اترے ہوئے تھے، وہ معرکۂ استاذ کے

وارث ہوئے، عین وہی شعلہ ان کے آتش دان میں بھی گرم تھا، اس لیے ''رَن'' شباب آشنا ہوا۔

مرکزی ساقی کو قریہ قریہ جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، حق شناس بادہ خوار، ترجمانی میں کفایت کرتے ہیں، گل چیں، کمالاتِ چمن کے بہترین سفیر ہوتے ہیں، تکمیل ادب کی درس گاہ میں، آپ درس نہیں دیتے تھے، کلیجہ نکال کر رکھ دیتے تھے، یہاں آپ نے نسلوں کی آب یاری کی ہے، آج مدارس میں جدید عربی کی جو بہار ہے، ادب کے شعبے قائم ہیں، اردو انجمنوں کے جلو میں، عربی بزم بھی سجی ہیں، تحریر وتقریر کی مشق وقواعد کا ماحول گرم ہے، عربی انجمنوں کے کلیدی پروگراموں کی سرپرستی کے لیے، مادرعلمی سے اساتذہ کو مدعو کیا جارہا ہے، معتبر اداروں میں، تکمیل ادب کے فضلاء کی طلب کا، غیر معمولی رجحان ہے، غرض! عربی زبان وادب کی جولہر بیشتر مدارس میں آچکی ہے، اس صدقۂ جاریہ کا بڑا حصہ، استاذ گرامی حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کے، روشن نامۂ مبارک کی بہترین یادگار ہے۔

الداعی.......مآثر دیوبند کا باتوفیق نامہ بر

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری
(امیرخسرو)

صحافت، شاہِ جہاں ہے، انسانی انبوہ، یومیہ فکری وذہنی خوراک کے لیے، صحافتی آستانوں کا نیازمند ہوتا ہے، ذرائع ابلاغ کے تنوع نے، خواندگی کی شرط بھی اٹھادی ہے؛ بل کہ مرئی صحافت نے خواندوں کو بھی فتح کرلیا ہے، فارسی واردو کے برعکس، عربی زبان ہمارے معاشرے میں، روزمرہ کی گفتگو کا حصہ کبھی نہیں تھی؛ اس لیے عربی صحافت حاشیے پر رہی؛ برصغیر میں عربی صحافت، اپنے سرگرم سفر میں، دیگر اغراض ومقاصد کی احسان مند پائی گئی۔

دعوت وارشاد، علم وتحقیق، زبان وادب، عالم عربی سے رابطہ کاری؛ جیسے مقاصد کے تحت دینی مدارس سے نکلنے والے رسائل نے، بلاد ہند میں عربی صحافت کو زندہ رکھا، مرکزی اداروں نے اپنے عربی ترجمان بہت اہتمام سے شائع کیے، درس وتدریس کی طرح، اس باب میں بھی از ہر ہند، سالارِ قافلہ تھا، مادرعلمی میں عربی زبان کا پرچم، وحید العصر، حضرت مولانا وحید الزمان رحمہ اللہ نے بلند کیا تھا، ایک زندہ اور اظہار خیال کی تازہ زبان کے طور پر، ہمارے احاطے میں، اس کا تعارف کرانے والے آپ ہی ہیں؛ اپنی محبوب زبان کی ترویج کے لیے، حضرت والا نے متعدد ومتنوع خاکے مرتب

کیے، اس حوالے سے آپ کا ترکش تیروں سے معمور تھا، اس سنہرے سلسلے کو تحریر کی بیش قیمت کڑیوں نے زینت دی، اندرون احاطہ نکلنے والے دیواری پرچوں کی داستان دراز ہے، بیرونی دنیا سے ہم کلامی کا آغاز ۱۹۶۵ء میں رسالہ ''دعوۃ الحق'' سے کیا، جس نے اپنی عمر کی دس بہاریں دیکھیں اور ۱۹۷۵ء میں موقوف ہوگیا۔

پھر ایک مختصر وقفے کے بعد، اس کی جگہ، ایک ایسے نئے رسالے نے لی؛ جس کے لیے سعادت وتوفیق کی نئی داستان مقدر تھی، جس کی شہرت کائنات کی وسعتوں کو طے کرنے والی تھی، جس کا فیض عرب وعجم؛ دونوں کو اپنے دائرے میں لینے والا تھا، جو دارالعلوم دیوبند کے متاعِ فخر میں، بیش قیمت اضافہ کرنے والا تھا، جو مادرِ علمی کا مستند وثقہ ترجمان بننے والا تھا۔

اس گل شن کے برگ وبار، حضرت مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ سے بھی منسوب ہو سکتے ہیں؛ کیوں کہ وہ اس کے بانی تھے؛ اس کے حسن کا کچھ حصہ، مدیر دوم، حضرت مولانا بدرالحسن قاسمی دامت برکاتہم کی بھی یاد تازہ کرتا ہے کہ وہ بھی اپنے استاذ کے نقشِ قدم پر تھے؛ لیکن ۱۹۷۵ء کی نوزائدگی سے، ۲۰۲۱ء کے شباب تک کا سفر، جس جاں کاہی کی داستان سے عبارت ہے، وہ اس کے عاشقِ شیدا، عربی زبان کے محبّ صادق، مادرِ علمی کے سب سے مضبوط ترجمان، استاذِ گرامی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کا نذرانۂ حیات ہے۔

اسی کی دہائی کے شروع میں، عام کاغذ پر، سادہ ہیئت اور معمولی پیرہن کے ساتھ شائع ہونے والا یہ پندرہ روزہ مجلّہ، زبان، ادب، فکر، تخلیق اور صحافت کے حوالوں سے بھی خاص امتیاز کا حامل نہیں تھا، اس کو معاصر عربی رسائل کی دوڑ میں شامل کرنے کے لیے، استاذِ گرامی نے، خونِ جگر سے سمجھوتہ کیا، اس کی ترقی کے سفر میں حضرت کا شباب اور اس کی رعنائیاں، صحت اور اس کے راحتیں، توانائی اور اس کی طالع آزمائیاں، بہارِ حیات اور اس کے نسیم وصبا، حرکت وعمل اور ان کا شور وفغاں، امتحان زندگی اور اس کے نشیب وفراز، متاعِ وقت اور مشاغلِ علم وعمل؛ غرض! خرمنِ زیست بلا کم وکاست کام آیا؛ تا آں کہ وہ وقت بھی آیا، جب الداعی اور وہ ایک دوسرے کا تعارف اور شناخت بن گئے، الداعی ان کے بغیر اور وہ الداعی کے بغیر متصور نہیں تھے۔

اپنی افتاد میں وہ سفر سے متوحش تھے، ملک بھر سے مرکزی اداروں کے موقر دعوت نامے آستانے پر ہجوم کرتے تھے؛ لیکن اسی عذر طبع کی وجہ سے شرف قبولیت سے محروم رہتے تھے؛ مگر ایک سفر اس عذر سے مستثنیٰ رہا، مجلّہ الداعی کے حسن ومعیار کی راہ کے بڑے بڑے خواب، ان کو ہر ماہ پرانی

دہلی کی تنگ وتاریک گلیوں میں پہنچا دیتے تھے، عناوین کے کاتبوں، سرناموں کے تزئین کاروں، جلدسازوں، پریس کے مالکوں، کاغذ کے تاجروں وغیرہ سے، عہدہ برآ ہونے کے لیے، وہ خود قدم رنجہ فرماتے تھے، الداعی کی زینت کے لیے، انھوں نے اپنے اس اصول کوخود پرسختی سے نافذ کیا کہ اگر کسی کام کوعمدگی سے کرنا چاہتے ہو، تو اسے خود کرو۔

حرفِ شیریں

مر بھی جاؤں تو کیا لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، میرے ہونے کی گواہی دیں گے

درس، ہزارخوبیوں کا سررشتہ ہے، علمی ترقیاں ہمارے فاضل کو، ہشت پہلو شخصیت میں تبدیل کردیتی ہیں، فیض کا تنوع مختلف میدانوں کا فاتح بنادیتا ہے؛ لیکن شخصیت کا نزدیکی تجزیہ واضح کرتا ہے کہ بیشتر کمالات کی تخلیق، مشغلۂ تدریس کے بطن سے ہوئی ہے، واقعی درس وتدریس کی برکات بے پناہ ہیں، دروس کے نکات کا جوش واُبال، یکا یک شارح بنادیتا ہے، نقول کا فرق اور وجہِ فرق کی جستجو، ایک محقق کی دریافت پرمنتہی ہوتی ہے، اختلافی مباحث، ہمیں اجتہاد کے راہ نورد دیتے ہیں، فرق باطلہ کی کج حجتی کی کوکھ سے، مناظرین جنم لیتے ہیں، رقاق وزہد کے اسباق، مبلغین اور واعظین چھانٹ لیتے ہیں، غرض! ایک رشتۂ تدریس ہے اور ہزار عناوین رہینِ احسان ہیں۔

حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کا یہ فیصلہ حیات بخش اور بابرکت ثابت ہوا کہ وہ مدرسہ شاہی مرادآباد کے پروگرام کی، مبسوط تقریر کو کتابی شکل دیں، حرفِ شیریں، انھیں شذرات کی جھلک ہے، جوآپ تکمیل ادب میں دہائیوں سے بکھیرتے آئے ہیں، مدارس میں گذشتہ دو دہائیوں میں جوخوش گوار تبدیلیاں آئی ہیں، وہ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ سے بہ وجوہ منسوب ہیں: ۱- مختارات میں تو وہ انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتے ہی تھے، ۲- دوم، فیض یافتہ فضلا کی جدید کھیپ نے، اس مشن کو آگے بڑھایا، ۳- تیسرا حوالہ، نگینوں سے مزین یہ مرقع ہے، جسے حرف شیریں سے یاد کیا گیا۔

تحریر میں آپ کے یہاں وہی طرز وادا جلوہ افروز ہے، جوآپ کی تدریس کی شناخت رہا، تحریری تدقیق وتعمق، جس کا ایک جہاں مدح سرا ہے، اسی جذبے کا پرتو ہے، جو دورانِ تدریس نمایاں رہتا تھا، افادات کی ترسیل کا سودا، ہرنوع کی قنوطیت کے لیے پیغام موت تھا، تہی دامنی کا عہد رکھنے والوں کوبھی، آپ حیات بخش تلخ نسخے، گھوٹ گھوٹ کر پلاتے تھے، صحت کے عوارض کے ساتھ، تدریس کی توانائی، کرامت سے کم نہ تھی؛ گویا ہر ذرے کوستارہ بنانے کا حلف اٹھایا ہوا تھا، کسی کی بے

دلی، آپ کے ولولے کو سرد نہیں کرسکتی تھی، آپ کے سوز وساز کی ترجمانی کسی نے خوب کی ہے:

فغان جاں گسل رکھتا ہوں لیکن
نہیں سنتا میرا صیاد میری

اس ہدایت نامے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ مبتدی کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اسے محرم اسرار بنا کر چھوڑتا ہے، اس میں زبان وادب کی بسم اللہ بھی ہے اور سندِ فضیلت بھی، جملہ سازی سے شروع ہونے والا سفر، مضمون اور رسالے پر ختم ہوا ہے، ضروریات کے ساتھ آداب بھی سکھائے ہیں، محرمات کے ساتھ مکروہات سے بھی بچایا ہے، کتاب کا مطالعہ، تکمیل ادب کی درس گاہ میں پہنچا دیتا ہے؛ یہ کتاب آپ کے نصابِ اتالیقی کا بہترین نمونہ ہے۔

''پس مرگ زندہ''............ترجمان التراجم

اشرار کے انبوہ میں یہ خالدؓ وحیدرؓ
ابرار کی محفل میں غلام شہِ ابرار

(مائل ملیح آبادی)

خاکہ نویسی، سوانح نگاری، تاثراتی نگارشات، شخصیات کی تصویر کشی؛ یہ فن استاذ گرامی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کی علمی وفکری شخصیت کا بنیادی عنصر ہے، ''وہ کوہ کن کی بات'' سے، اردو زبان وادب کے گل شن میں، آپ کی سحر انگیز آمد نے سب کو چونکا دیا تھا، پھر آپ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، یکے بعد دیگرے، سوا [ ]نقوش کے انبار لگا دیے، اس میں شک نہیں کہ آپ کے قلم نے، جتنے کردار منتخب کیے، وہ یکتائے روزگار تھے؛ لیکن آپ کی سلیقہ مند نقاشی نے، ان کے حسن کو مزید نکھارا، ''پس مرگ زندہ'' کتاب نہیں، آب حیات ہے، وہ بھی دو مختلف سمتوں میں بہنے والا: ایک جانب کاروانِ رفتہ کو حیات بخشتا ہے، تو دوسری جانب آئندگان کو فیض کا ابدی چشمہ فراہم کرتا ہے۔

زندہ دلی، آزاد ذہانت اور متجسس دماغ نے، آپ کو غیر معمولی سوانح نگار بنایا، تدقیق وتحقیق آپ کے تراجم کا امتیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ اہم ترین شخصیات پر آپ کی تحریریں، تاخیر سے سامنے آتی تھیں، تحقیق ومراجعت کا سلسلہ دراز ہوتا تھا، متوفی کے اہل خانہ، خدام، متعلقین اور متوسلین سے، بہ تکرار رجوع فرماتے تھے، تنقیح طلب جزئیات کو بھرپور وقت دیتے تھے، استاذِ گرامی، حضرت مولانا ریاست علی بجنوری علیہ الرحمہ پر لکھنے سے قبل، مجھ سے کئی باتیں دریافت کیں، ایضاح البخاری کے کام میں، میری معاونت سے متعلق تفصیلی استفسار فرمایا، اسی طرح ''خلاصۃ التفاسیر'' کے کام کی

نوعیت بھی تحریری شکل میں طلب فرمائی اوران تفصیلات کواپنے مقالے میں جگہ بھی دی۔

آپ سوانح نگاری کے اس امتحان میں سرخ رو ہیں، ''پس مرگ زندہ''، شخصیات کی تصویر کشی میں افراط وتفریط سے منزہ ہے، اکابر کی کہکشاں میں ہر ستارہ اسی جگہ ہے، جہاں میزان عمل کی پرواز نے اجازت دی ہے، معلوم ہے کہ بیشتر کمالات؛ بڑوں کی سیرت کا قدر مشترک ہے؛ تخلیق کار کا کمال یہ ہے کہ وہ وجوہِ امتیاز کو سامنے لائے۔

حضرت کے تراجم اس جوہر کی نمود سے آراستہ ومزین ہیں؛ چناں چہ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، ان کے یہاں ممتاز مؤرخ وسوانح نگار ہیں، حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیبؒ، وقت کے رازی وغزالی ہیں، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، میر کارواں ہیں، حضرت مولانا وحید الزماںؒ، عبقری معلم ہیں، حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ، کو وہ فقہ وفتاوی کی آخری کڑی کہتے ہیں، حضرت مولانا منظور نعمانیؒ، ان کے نزدیک ہمہ جہت خادم دین ہیں، حضرت قاری صدیق باندویؒ مجسم مقبولیت ومحبوبیت ہیں، حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ، کو وہ خاص فقہ قضا کے لیے ڈھلے ہوئے ذہن کے طور پر یاد کرتے ہیں، حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئیؒ، ان کے نزدیک داعیانِ حق کی زنجیر کا آخری حلقہ ہیں، حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کو، انھوں نے مرد آہن کے طور پر یاد کیا ہے؛ غرض! شخصیت کے تمام گوشوں کا جائزہ لینے کے بعد، خاص اس عنصر کو دریافت کرتے ہیں، جو شخصیت سازی کا بنیادی جزو ہو؛ اس طرح وہ نچوڑ وعطر نکالنے میں بھی، قاری کے منت کش نہیں ہوتے۔

حضرت الاستاذ کے تراجم کی کثرت وتنوع، گہرائی وگیرائی، مختلف الجہات تجزیے، خارجی شخصیت پر منطبق ہوتی سچی تصویر کشی، نوع بہ نوع شخصیات کا انتخاب اوران کے مختلف پہلوؤں کا بھر پور احاطہ؛ جیسی درجنوں خوبیاں آپ کو اس عہد کے عظیم ترجمہ نگار کا رتبہ دلاتی ہیں، اس ضمن میں آپ نے جو اثاثہ چھوڑا ہے، وہ نسلوں کی تربیت اوران کی علمی وفکری آب یاری کا شان دار عنوان ہے۔

فلسطین........غمزۂ جذب وکشش، عشوۂ غیرت وناموس، وجہِ گریۂ خونیں

اتنا سادہ نہ بن تجھ کو معلوم ہے
کون گھیرے ہوئے ہے فلسطین کو

(حبیب جالب)

ادب وانشا اور زبان وسخن کے جلووں میں، استاذِ گرامی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کی، ہمہ جہت شخصیت کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں، وہ اسلامی اور ملی مسائل میں، حد درجہ

حساس طبیعت کے مالک تھے،سقوطِ طالبان کے بعد انھوں نے فرمایا تھا کہ میری تخلیقی صلاحیت کند اور پژمردہ ہوگئی،ملت کے داخلی وخارجی مصالح کا ان کو گہرا ادراک تھا،''جانِ پرسوز''ملی نشیب وفراز سے ہلکان تھی،صحافتی مصروفیت نے بھی،اس آتش کی شدت وحدت میں اپنا حصہ شامل کیا تھا۔

مسئلۂ فلسطین ،ملت اسلامیہ کے لیے، جدید دور کا سب سے بڑا زخم ہے، گذشتہ ستر سال کا طویل دورانیہ،اس کو بھرنے میں ناکام رہا ہے،آیندہ ستر سال کا وقت بھی اس کا مرہم نہیں ہوسکتا، وہ مجرد خطۂ ارض نہیں ؛ بل کہ قبلۂ اول ہے،خود صاحبِ نبوت نے،اس ارض پر جبہہ سائی کی ہے،قدمِ محمدی نے،اس کی عزت کو عروج بخشا ہے، وہ ہمارے لیے تیسرا حرم ہے،قرآن اس کی برکتوں کے حوالے دیتا ہے، وہ اہل ایماں کا مرکزِ جذب وکشش اور محورِ غیرت وناموس ہے۔

ارض مبارک کے مسئلے پر آپ کی تحریریں، جامعیت، فنی کمال، موضوع کی سیرابی، دور افتادہ گوشوں کی آسودگی، جزئیات کی تنقیح وتفصیل وغیرہ میں اپنی نظیر خود ہیں؛ بہت مشکل ہے کہ کسی نے قدس پر، اتنا جامع ومکمل تحریری سرمایہ چھوڑا ہو، وہ سرزمین مقدس کے جغرافیے کو بیان کرتے ہیں،تو اس کی واقعی حدود کی نشاندہی میں، تعمق وتدقیق کی تعبیرات کو پھیکا کردیتے ہیں،اس کے مادی وسائل کو کھولتے ہیں،تو وہ قدرتی چشموں وذخائر میں رشکِ عالم نظر آتی ہے، تاریخی اوراق الٹتے ہیں تو بہت دور نکل جاتے ہیں،ظلم کی تازہ داستان چھیڑتے ہیں،تو کلیم عاجز کے اشعار،شرم سار نظر آتے ہیں،ان کے تحریریں، ۱۹۴۷ء، ۱۹۹۶ء، ۲۰۰۸ء، ۲۰۱۴ء کے قتل عام کی مستند ومفصل دستاویز ہیں۔

فلسطین میں مغربی ڈرامے کو، انھوں نے سبق اور درس کی طرح پڑھا تھا، وہ متون کی لکیروں کے فقیر نہیں تھے؛ بل کہ حواشی اور بین السطور کے محرم تھے، مذاکرات کی خوب صورت میزیں،شرم الشیخ کی دل ربائیاں، کیمپ ڈیوڈ کے اعزازات،ان کی نگاہِ حق بیں میں، کبھی وقعت نہیں پا سکے، فتح اور حماس کی جداگانہ راہوں میں سے، ایک کا انتخاب،ان کے لیے کبھی مسئلہ نہیں بنا، ۲۰۰۶ء میں حماس کی انتخابی فتح کا جشن منانے والوں میں،آپ کا قلم حق پرست پیش پیش تھا، وہ اس اصول کے ترجمان تھے کہ جو حق بہ زور بازو غصب ہوا ہے،اس کی واپسی قوت بازو کے بغیر ممکن نہیں، راہِ پُرخطر کے سوا،تمام راہیں کھڈوں میں گراتی ہیں اوران کھڈوں کو دلدل میں تبدیل بھی کرتی ہیں۔

خاتمہ

''مہلتِ کم''-جس کو ہم نے عمر کا نام دیا ہے- کی نیرنگی ملاحظہ ہو کہ باغِ قدس کی ویرانی کا تاریخ ساز نوحہ خواں اوراس کی بازیابی کی تحریک کا سب سے بڑا نوا سرا؛ جب عمر عزیز کے آخری سانس لے رہا

تھا،تو اس مقدس سرزمین پر،ایک نئی صبح طلوع ہونے والی تھی،جس کو دیکھنے کے لیے ان کی انمول زندگی نے،خواب سجائے تھے اور عمر بھر آہِ سحر گاہی کو آباد کیا تھا،حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی وفات ۳؍مئی کو ہوئی؛جب کہ فلسطین کی حالیہ رزم کا دورانیہ،۱۰؍مئی سے،۲۱؍مئی کے درمیان ہے؛ گویا رب کائنات نے،ان کی نوائے زیست کو،شرف قبولیت سے نوازنے کے لیے اپنے پاس بلایا؛ اہل نظر کا تجزیہ یہی ہے کہ غزہ کی مذکورہ،مزاحمت وثابت قدمی میں،آیندہ کل کی مکمل فتح بھی جھانک رہی ہے۔

القصہ! حضرت والا اب ہمارے درمیان نہیں رہے؛ لیکن ان کے نقوش سینہ وسفینہ، ہمیشہ درخشاں وتابندہ رہیں گے،وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوئے ہیں؛لیکن ہمارے احساس میں،ان کا سراپا،زندہ وروشن رہے گا:

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

یہ سطورِ پراگندہ،سوانح کی تعبیر سے فروتر ہیں،ان کو تاثرات سے زائد سمجھنا بے محل ہوگا؛ میرے لیے یہی تصور،اثاثہ ہے کہ ان مشاہدات کی ترتیب نے،حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی یادوں میں،کچھ وقت گزارنے کا بہانہ فراہم کیا۔

اللہ تعالی حضرت علیہ الرحمہ کی باقیات کو بہترین صدقۂ جاریہ بنائے،آپ کو جنت الفردوس کے مکینوں میں شامل فرمائے،قربِ خاص عطا فرمائے،انبیاء کرام،صدقین،صالحین،شہدا اور جملہ خدام دین کے مابین سرخ رو فرمائے،آمین، **وصلی اللہ تعالی، وسلم، علی خیر خلقه، محمد وعلی آله، وصحبه أجمعین۔**

❁ ❁ ❁

مولانا نور عالم خلیل امینی: ایک خودساز شخصیت

از: مولانا محمد ساجد قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

وہ کل کے غم وعیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج خود افروز وجگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

مورخہ ۲۰/رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ (مطابق ۳/مئی ۲۰۲۱ء) کو دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاذ، عربی اردو زبان کے ادیب ومصنف، عربی ماہنامہ الداعی کے مدیر حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی اپنے ہزاروں شاگرد اور متعلقین کو سوگوار چھوڑ کر جوار رحمت میں منتقل ہوگئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وإِنَّا إِلیه رَاجِعُونَ۔

آپ عربی زبان کے ممتاز ادیب وقلم کار، عظیم مؤلف اور ایک کامیاب وباتوفیق مدرس تھے، آپ نے تقریباً نصف صدی عربی زبان وادب کی خدمت کی اور اس دوران آپ سے ہزاروں شاگردوں نے اکتسابِ فیض کیا، اور عربی واردو میں پچاسوں کتابیں اور سیکڑوں مقالات یادگار چھوڑے جو یقیناً اسلامی لائبریری میں اہم اور قیمتی اضافہ ہیں۔ جہاں آپ نے عربی زبان وادب کو اپنا اختصاصی فن بنایا اور اس میں لکھنے، بولنے اور اس کی تدریس میں مہارت حاصل کی، وہیں آپ نے عالم عرب کے حالات ومسائل کا بہت گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا اور اس پر مستقل کتابیں اور مقالات تحریر کیے۔

آپ کو عربی کی طرح اردو زبان پر بھی کامل دستگاہ حاصل تھی؛ چنانچہ وہ کوہ کن کی بات، پس مرگ زندہ، کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے؟ صلیبی صہیونی جنگ، اور رفتگان نارفتہ وغیرہ اردو ادب کا شاہکار ہیں۔ جس طرح آپ کی تحریریں عربی حلقوں میں دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں، اسی طرح اردو حلقوں میں بھی آپ کی تحریریں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ مدارس کے فضلاء میں اردو قلم کاروں

میں آپ ایک خاص رنگ وآہنگ کے مالک تھے اوراپنی تحریروں میں ادبی چاشنی، اردواملاء اورقواعد ترقیم وغیرہ کی رعایت کی وجہ سے آپ کوخاصی شہرت حاصل تھی۔

تعلیم وتربیت

آپ کا بچپن یتیمی میں گزرا،ابھی تین ماہ کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا،انھوں نے اپنے پیچھے کوئی قابل ذکرترکہ بھی نہیں چھوڑا؛ چنانچہ آپ کی نشؤونما یتیمی اورمفلسی کے عالم میں ہوئی، آپ کی والدہ اوردادی نے آپ کی تعلیم وتربیت کی ذمے داری سنبھالی اورآپ نے اسی حالت میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ آپ کوشروع ہی سے یتیمی کے احساس نے اپناوقت نہ ضائع کرنے،خوب محنت کرنے اورزندگی میں اپنی راہ بنانے پر مہمیز کیا۔ تاریخ میں ایسی بہت سی شخصیات گزری ہیں کہ جنھوں نے یتیمی کی حالت میں آنکھیں کھولیں اوراس احساس نے انھیں محنت وجا□نی پر آمادہ کیا اورانھوں اپنی زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

مولانا نے اپنے گاؤں کے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی،جس میں مولوی ابراہیم نام کے ایک معلم تعلیم دیتے تھے، جو بہت دیندار، نیک وصالح آدمی تھے،طلبہ کے بڑے ہمدرداور بہی خواہ تھے، وہ انھیں کچھ بنانا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی وہ بہت اچھے خطاط بھی تھے اورطلبہ کوبھی خوشخطی سکھاتے تھے۔ مولانا امینی نے ان مولوی صاحب کا اپنی تحریروں میں بہت تذکرہ کیا ہے، کہ انھوں نے ہی ہم لوگوں کولکھنے پڑھنے کے راستے پر ڈالا ہے جس پر چل کرہم یہاں تک پہنچے۔

مولانا نے اپنے علاقے کے مدارس میں بھی ناظرہ، پرائمری اور فارسی کی تعلیم حاصل کی جن میں مدرسہ امدادیہ دربھنگہ قابل ذکر ہے۔ مولانا کے ہم وطن نوجوان فاضل مولانا اویس رائے پوری اس مدرسے میں مدرس تھے، آپ کی دادی نے آپ کومولانا اویس کے ہمراہ بھیج کراس مدرسے میں داخل کرایا۔ آپ نے اس مدرسے میں فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا اویس صاحب کا مولانا نے بہت اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے کہ موصوف نے اس مدرسے میں آپ کی سرپرستی کی اوراپنے بھائی کے ساتھ اپنے کمرے میں ہی رکھا اور بہت ساری چیزیں سکھائیں: رہن سہن کا طریقہ اورمختلف کام کرنے کے انداز سکھائے۔ مولانا امینی کوزندگی کے مختلف کاموں کے کرنے کا بہت سلیقہ تھا، اور وہ دوسروں کوبھی یہ سلیقہ سکھاتے تھے۔

اپنے علاقے کے مکاتب ومدارس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے اپنے ہم وطن طلبہ کے

ہمراہ دارالعلوم مئو کے لیے رخت سفر باندھا؛ چنانچہ آپ نے اس مدرسے میں اول عربی میں داخلہ لیا اور چہارم عربی تک اس میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کو یہاں تعلیمی ماحول ملا، نیک وصالح اساتذہ میسر ہوئے، آپ نے یہاں خوب محنت کی اور ایک استاذ محترم نے تعلیم المتعلم کے ذریعہ عربی جملہ سازی کی خوب مشق کرائی۔ آپ نے اس کتاب میں علم کا شوق ابھارنے والے اشعار یاد کرلیے؛ نہ صرف وہ اشعار یاد کیے؛ بلکہ ان کے مقتضا پر بھی عمل کیا؛ چنانچہ آپ یہاں رات کو دو بجے سے پہلے نہیں سوتے تھے۔ نیز یہاں جن استاذ سے ''شرح مائۃ عامل'' پڑھی انھوں نے اس کی عبارتوں کی کئی کئی تراکیب کرائیں۔ اس طرح آپ کو عبارت کی ترکیب وغیرہ پر بڑی قدرت حاصل ہوگئی؛ چنانچہ عربی زبان کا شوق آپ کو اسی مدرسے سے ہوا اور دارالعلوم دیوبند پہنچ کر وہ دوآتشہ ہوگیا۔

مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں سال پنجم عربی میں داخلہ لیا، آپ نے حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ سے ''مقامات حریری'' پڑھی اور ''الصّف الثانوی'' میں عربی زبان کی مشق کی، نیز آپ ''النادی الادبی'' سے بھی منسلک ہوگئے جس میں حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی نے آپ کو النادی سے نکلنے والے دیواری ماہنامہ "النهضة" کا ایڈیٹر مقرر کیا؛ چنانچہ آپ نے اس ماہنامے میں عربی مضمون نگاری اور عربی تحریر کی مشق کی۔

آپ یہاں مولانا کیرانوی کی دلآویز اور مثالی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے، آپ نے ان سے نہ صرف عربی زبان سیکھی؛ بلکہ زندگی گزارنے کا فن بھی سیکھا۔ مولانا کیرانوی عربی زبان کے بے مثال معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مربی بھی تھے اور النادی کے اسٹیج سے عربی لکھنے اور بولنے والے افراد کی ایک کھیپ تیار کی۔ مولانا امینی حضرت مولانا کے ہی تربیت یافتہ تھے آپ نے مولانا سے سلیقہ مندی اور نستعلیقیت بھی سیکھی اور جو چیزیں آپ نے مولانا سے سیکھیں پوری زندگی ان پر عمل پیرا رہے۔ آپ کی شخصیت سازی میں اپنی اخاذ طبیعت اور مولانا کیرانوی کی مردم ساز شخصیت کا بڑا کردار تھا۔

عربی زبان کا شوق

دارالعلوم مئو میں طالب علمی کے زمانے ہی سے آپ کو عربی زبان سے دلچسپی ہوگئی تھی؛ چنانچہ آپ نے وہیں عربی میں جملہ سازی کی مشق کی تھیں، پھر جب آپ دارالعلوم میں آئے تو اس ذوق کو فروغ ملا اور مولانا کیرانوی سے تعلق اور ان سے عربی سیکھنے کا قیمتی موقع بہم پہنچا اور ''النادی الادبی''

کی زیرنگرانی اپنی تقریر وتحریر کی صلاحیت کو اجاگر کرنے کا خوب خوب موقع ملا اور یہ ذوق ایک قسم کے عربی زبان کے عشق میں تبدیل ہوگیا، اس کی کیفیت یہ تھی جسے کسی شاعر نے کہا ہے:

أتَانی هَواهَا قَبْلَ أنْ أعرِف الهوی فصَادَفَ قَلْبًا خالِیًا فتمَكّنَا

مولانا امینی کسی وجہ سے دارالعلوم میں تعلیم کی تکمیل نہ کرسکے، مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندی سے دورۂ حدیث پڑھا اور وہیں سے سندِ فراغت حاصل کی۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی سے تعلق

مدرسہ امینیہ سے فراغت کے بعد آپ نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے کا پروگرام بنایا؛ چنانچہ اس کے لیے آپ نے عربی میں ایک درخواست لکھی جس پر حضرت مولانا علی میاں ندوی سے سفارش لکھوائی اور اسے جامعہ اسلامیہ کے پتے پر بھیج دیا۔ ان دنوں حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندی آپ کے سرپرست تھے۔ حضرت مولانا علی میاں ندوی کو آپ کی تحریر اور عربی بہت اچھی لگی اور اس سے بہت متاثر ہوئے اور مولانا محمد میاں کو خط لکھا کہ جامعہ اسلامیہ سے جب تک کوئی جواب نہیں آتا تب تک کے لیے ان کو میرے پاس بھیج دو۔

آپ حضرت مولانا علی میاں کے پاس تکیہ کلاں رائے بریلی پہنچے، انھوں نے آپ کو وہیں روک لیا؛ تاکہ آپ ان کے پاس رہ کر عربی ادبیات کا مطالعہ کریں اور ان کے علمی کاموں میں تعاون کریں؛ چنانچہ آپ نے وہاں حیاتی از احمد امین اور الامالی از ابوعلی قالی اور وفیات الأعیان از ابن خلکان کا مطالعہ کیا، اور مولانا نے اپنی کتاب السیرۃ النبویہ آپ کو املا کرائی، اس کے بعد آپ نے اسے خط نسخ میں صاف بھی کیا، آپ کا خط بہت خوبصورت تھا، بعض مہمانوں سے مولانا نے آپ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ هذا كاتب بالمعنيين۔ نیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے پروفیسر خسرو صاحب مولانا علی میاں ندوی کے یہاں آئے تو مولانا نے انھیں السیرۃ النبویۃ کا مبیضہ دکھایا اور پوچھا کہ یہ کتابت ہے یا چھپائی تو انھوں نے کہا کہ چھپا ہوا ہے تو مولانا نے کہا کہ یہ ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور انھوں نے لکھا ہے، پروفیسر صاحب بہت متاثر ہوئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس اور علمی سرگرمیاں

مولانا امینی حضرت مولانا علی میاں ندوی کے پاس رہ کر ادب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور

مولانا کے علمی کاموں میں مدد کرتے تھے؛ لیکن آپ کے معاشی حالات نے اس طرح زیادہ دنوں تک رہنے کی اجازت نہیں دی؛ چنانچہ ایک دن آپ نے اپنے حالات اور گھر کی معاشی پریشانی مولانا نے کے سامنے تفصیل سے بیان کی۔ مولانا نے آپ کے لکھنے پڑھنے کے ذوق وشوق کو دیکھ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آپ کا تقرر کرادیا؛ چنانچہ آپ سے ادب وانشاء کے مضامین متعلق ہوئے اور آپ کے اسباق کو طلبہ نے کافی پسند کیا؛ چونکہ آپ نے حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی سے عربی پڑھی تھی اور ان سے عربی زبان کی تدریس کا انداز سیکھا تھا؛ اس لیے طلبہ آپ کے انشاء کے مضمون کو پسند کرتے تھے۔ اگر کسی جماعت میں دو سیکشن ہوتے تو طلبہ آپ کے سیکشن میں رہنا پسند کرتے تھے۔ آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تقریبًا نو سال گزارے، اس دوران آپ نے ادب وانشاء کی متعلقہ کتب کی تدریس کا کام انجام دیا اور ''الرائد اور البعث الاسلامی'' میں مضامین لکھے اور اردو مضامین کے ترجمے کیے۔ نیز یہاں رہتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں ندوی کی کتاب أحاديث صريحه إلى باكستان، التفسير السياسي للإسلام، مولانا محمد منظور نعمانی کی کتاب دعايات مكثفه ضد الإمام محمد بن عبد الوهاب، الثورة الإيرانيه في ميزان الإسلام اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب سيدنا معاويه رضي الله عنه والوثائق التاريخيه، اور ما هي النصرانيه ؟ کا ترجمہ کیا۔

ساتھ ہی یہاں رہتے ہوئے آپ کو مولانا محمد الحسنی صاحبؒ مدیر ماہنامہ ''البعث الاسلامی'' کے ساتھ بھی رہنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا؛ چنانچہ آپ ان کی شرافت اور زبان وادب سے بہت متاثر تھے اور آپ نے ہی انھیں مشورہ دیا تھا کہ البعث الاسلامی کے اداریوں کو کتابی شکل میں لے آئیں؛ چنانچہ آپ نے وہ اداریے مرتب کیے جن کو دار الاعتصام قاہرہ نے الإسلام الممتحن کے نام سے شائع کیا۔

مولانا کا کہنا تھا کہ ندوہ میں بہت اچھا وقت گزرا، وہاں اگر کوئی چیز بری لگی تو وہ بعض لوگوں کی جانب سے دارالعلوم دیوبند پر تنقید اور اس کی توہین وتنقیص تھی۔

دارالعلوم دیوبند میں تدریس وعربی صحافت

دارالعلوم دیوبند سے جانے کے بعد دہلی میں قیام اور ندوہ میں تدریس کے دوران بھی اپنے مربی ومشفق استاذ حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی سے آپ کا مسلسل رابطہ قائم رہا؛ چنانچہ ۱۹۸۲ء

میں حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی نے آپ کا دارالعلوم دیوبند میں استاذ ادب اور مدیر جریدہ الداعی کے طور پر تقرر کرادیا۔ آپ نے یہاں آ کر ادب کے مضمون کی تدریس کا کام کیا، آپ سے تکمیل ادب، تخصص فی الادب کی کتب اور ششم عربی میں دیوان متنبّی متعلق رہیں، یہاں آپ سے ہزاروں طلبہ نے اکتسابِ فیض کیا۔ نیز پندرہ روزہ جریدہ الداعی کی ذمے داری سنبھال لی اور تقریباً ۳۹ سال اس کی کامیاب ادارت کی۔ آپ کے مطالبہ پر دارالعلوم کی مجلس شوری نے ۱۹۹۳ء میں پندرہ روزہ جریدے کو ماہنامہ ''الداعی'' میں تبدیل کردیا؛ چنانچہ آج تک وہ ماہنامے کی شکل میں نکل رہا ہے۔

آپ کو عربی صحافت اور کسی جریدے یا مجلّے کی ایڈیٹرشپ کا بہت شوق تھا، جریدہ الداعی کی ادارت ملنے سے آپ کی دلی خواہش کی تکمیل ہوئی، آپ نے اس کو معیاری بنانے کے لیے اپنی صلاحیتیں جھونک دیں اور اسے عربی صحافت میں بلند مقام حاصل تک پہنچایا، جس کا اعتراف خود عرب قارئین نے کیا ہے۔ آپ کے ''اداریے'' اور ''اشراقے'' قارئین کافی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ آپ نے عالمِ اسلام خصوصاً عالم عرب کے مسائل کے سلسلے میں دراز نفس تحریریں لکھیں اور ان کو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے پیش کیا، جن میں مسئلۂ فلسطین سرفہرست ہے۔ اس مسئلے پر آپ کی تحریروں کا مجموعہ مستقل اور ضخیم کتاب کی شکل اختیار کرگیا جو ''فلسطین فی انتظار صلاح دین'' کے نام سے موسوم ہے۔ آپ نے اردو قارئین کے لیے اس کا ترجمہ بھی کردیا جو ''فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں'' کے نام سے شائع ہوا۔

نیز عراق کا کویت پر حملہ، پھر امریکی فوج کا سعودی کی سرزمین پر اترنا، امریکہ کا عراق پر حملہ، نیز امریکہ کا افغانستان پر حملہ وغیرہ ان مسائل پر آپ نے بہت لکھا اور ان مضامین کا اردو بھی ترجمہ کیا جن سے کئی کتابیں تیار ہوگئیں۔

ایک دن عصر کے بعد کی ملاقات میں مجھ سے کہنے لگے کہ میں عالمِ عرب کے مسائل پر بہت لکھتا ہوں، ایک دن میں نے حضرت مولانا علی میاں ندوی کو خواب میں دیکھا تو انھوں نے میرے ان مسائل پر لکھنے کی تائید کی، مجھے اب اطمینان ہوگیا کہ میں صحیح رخ پر کام کررہا ہوں۔

آپ کو اپنی عربی اردو زبان پر بہت اعتماد تھا، اکابر دارالعلوم دیوبند کے عاشق تھے بالخصوص حضرت تھانویؒ کے۔ دارالعلوم کے مسلک ومشرب کے شیدائی تھے۔ حضرت مولانا علی میاں ندوی اور شیخ بن باز کی میں نے آپ کی زبان سے بڑی تعریف سنی۔

آپ احمد امین مصری کی تحریروں کو بہت پسند کرتے تھے ساتھ ہی اس کے فکری انحراف پر تنقید

بھی کرتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ میں علی طنطاوی کی کتاب نہیں پڑھ پاتا ہوں، جب کہ احمد امین کی تحریروں میں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ بعض ادبا کی تحریروں سے کچھ حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے، جب کہ بعض دینے کے حوالے سے بڑے فیاض واقع ہوتے ہیں۔

آپ کا اسلوب نگارش عربی میں ادبی اور دعوتی ہے، آپ کے پاس الفاظ اور مترادفات کا بڑا ذخیرہ تھا، جس طرح چاہتے تھے، ان میں تصرف کرتے تھے۔ آپ کی تحریروں میں بلا کا تسلسل اور روانی ہوتی ہے۔ آپ کا کہنا تھا کہ میرا ذوق انشائی ہے، تحقیقی نہیں۔ ''اشراقہ'' آپ کی تحریروں میں شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے؛ کیونکہ اس میں سادگی بے تکلفی اور انشائیت ہوتی ہے اور اس میں آپ کا قلم رواں دواں چلتا ہے۔

عادات واخلاق

مولانا انتہائی ذہین وطباع، ذکی الحس، باریک بیں، دوراندیش، ظریف الطبع، مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے، آپ بڑے غیور اور خوددار واقع ہوئے تھے، بہت صاف گو بے باک اور نڈر تھے۔ گفتگو بہت صاف کرتے تھے، سننے والے کے لیے آپ کی کوئی بہت مبہم نہیں رہتی تھی۔ وقت کے بہت پابند تھے اسباق اور میٹنگوں میں وقت سے پہلے ہی پہنچتے تھے۔ اسباق اور اپنی مجالس میں ظرافت کی باتیں بھی کرتے تھے، جس سے طلبہ کو سبق وغیرہ میں کسی طرح کی اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی۔

آپ میانہ قد، مائل بدرازی تھے، خوش پوشاک، شیروانی اور دیوبندی ٹوپی زیب تن کرتے تھے یہی آپ کا باہر کا لباس تھا۔ نستعلیقیت اور وضع داری آپ کا امتیاز تھی۔ اخیر میں عصا بھی لے لیا تھا، جسے لے کر چلتے تھے۔ آپ تعلق کا بہت خیال رکھتے تھے۔ خلافِ مزاج باتوں پر برہم ہوجاتے تھے۔ جس کو وقت دیتے تو اس کا انتظار بھی کرتے۔ میرے ساتھ بارہا ایسا ہوا، اگر مقررہ وقت پر پہنچنے میں تھوڑی تاخیر ہوئی تو آپ خود فون کرتے اور پوچھتے کہ کہاں ہو؟ اشارۃً یا کنایۃً اہانت کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے۔

آپ سے میرا تعلق

میری آپ سے پہلی ملاقات ١٩٩۴ء میں ہوئی، اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ مولانا عبدالرشید صاحب بستوی (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند) جو اس وقت مرکز المعارف برانچ دیوبند کے مدیر تھے،

انھوں نے سیرت کے موضوع پر ایک تحریری مسابقہ کرایا، میں نے اس میں عربی میں مقالہ لکھ کر حصہ لیا، میری پہلی پوزیشن آئی ، میرا مقالہ مولانا عبدالرشید صاحب یا مولانا نے چیک کیا، اس کے بعد مولانا عبدالرشید صاحب مجھے مولانا سے ملاقات کرانے کے لیے لے گئے۔ مولانا نے مجھ سے معلوم کیا کہ کیا یہ مضمون آپ نے لکھا ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے (از راہ مزاح) فرمایا کہ اگر آپ نے لکھا ہے تو آپ مجھ سے اچھا لکھتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ میں نے اس کی تیاری میں محمدالغزالی کی "فقه السيرة" سے استفادہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: اپنے اندر انشائی صلاحیت بڑھاؤ!

آپ سے یہ تعلق برقرار رہا، جب میں دارالعلوم سے فارغ ہو کر چلا گیا تو بھی آپ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جب میں نے اور مولانا عبدالقدوس قاسمی نیرانوی نے مشترکہ طور پر ''القراءة العربیۃ'' کے سلسلے کا پہلا جزء لکھا تو آپ نے اس پر ''الداعی'' میں تبصرہ کیا اور اس کے سلسلے میں چند مفید مشورے دیے۔ جن پر ہم لوگوں نے اگلے حصوں میں عمل کیا۔

۲۰۰۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں میرا تقرر ہوا، میں عصر کے بعد آپ کے پاس جاتا تھا، ایک دن آپ نے مجھ سے معلوم کیا کہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے بتایا کہ دوم، سوم کی کتابیں متعلق ہیں۔ ان کے لیے مطالعہ میں کوئی زیادہ وقت نہیں لگتا ہے۔ باقی اوقات خارجی کتابوں کے مطالعے میں لگاتا ہوں۔ ایک دن مجھے بلایا، ان دنوں گجرات میں فساد ہوا تھا، مولانا کے سامنے روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' رکھا تھا جس میں مولانا اسرارالحق صاحب کا گجرات فساد پر مضمون تھا، مجھ سے کہا کہ گجرات فساد پر ایک عربی میں خبر لکھ دو یا مولانا اسرارالحق صاحب کے مضمون کا عربی میں ترجمہ کر دو۔ میں نے کہا: جیسا آپ فرمائیں۔ مولانا نے کہا کہ ترجمہ کر دو! میں نے ترجمہ کر کے دے دیا، تو اس کو ''الداعی'' میں شائع کیا۔ اگلے ماہ مجھے اردو اخبارات دیے اور گجرات فساد پر ایک رپورٹ لکھنے کے لیے کہا؛ چنانچہ میں نے اردو اخبارات کی خبروں کی روشنی میں ایک تفصیلی رپورٹ لکھی جسے الداعی کے اگلے شمارے میں شائع کیا۔ میں نے اگلے چند شماروں میں خبریں لکھیں۔ پھر ایک دن مجھ سے کہا کہ مولانا عبدالرشید بستویؒ نے حضرت نانوتویؒ کی کتاب ''حجۃ الاسلام'' کا عربی میں ترجمہ شروع کیا تھا، جس کی انھوں نے ابھی دو تین قسطیں لکھی تھیں؛ لیکن وہ اب دارالعلوم میں نہیں ہیں؛ اس لیے وہ ترجمہ تم کرو۔ میں نے ہامی بھر لی اور ترجمہ شروع کر دیا؛ چنانچہ میں نے ''حجۃ الاسلام'' کا ترجمہ ''الداعی'' میں قسطوار لکھ کر مکمل کر لیا۔ اس کے بعد ''انتصار الاسلام'' کا ترجمہ کیا، پھر ''میلۂ خداشناسی، مباحثۂ شاہ جہانپور''، ''قبلہ نما''، اور ''تصفیۃ العقائد'' کے ترجمے مکمل کیے اور یہ سب اولاً قسطوار ''الداعی'' میں شائع

ہوئے، اس کے بعد ان کو کتابی شکل میں ''شیخ الہند اکیڈمی'' نے شائع کیا۔ مولانا کی تحریک پر میں نے حضرت نانوتویؒ کی مذکورہ چھ کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے۔ اول الذکر کتاب پر مہتمم صاحب (حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری) کی جانب سے آپ نے مقدمہ بھی لکھا۔

مولانا کے ساتھ طویل عرصہ کام کرنے کا اتفاق ہوا، کتابوں کے ترجمے کے علاوہ کبھی مہمانوں کی آمد پر ''الداعی'' کے لیے رپورٹ تیار کرنا، یا كلمة التحية لکھنا یا مضامین وغیرہ لکھنا ہوا، مولانا نے جب بھی مجھ سے کوئی کام کہا اور میں نے اسے کر دیا تو بہت خوش ہوئے اور بہت دعائیں دیں۔ الصحابة ومكانتهم في الإسلام کے اردو ترجمے کی تصحیح میں مجھے ساتھ رکھا، جب اس کے نام رکھنے کا وقت آیا تو مجھ سے کہا، اس کا کیا نام ہونا چاہیے؟ میں نے چند نام لکھ کر پیش کیے ان میں سے ''صحابۂ رسول اسلام کی نظر میں''، پسند کیا۔ اور یہی اس کا نام تجویز کر دیا۔

آپ نے میری چار کتابوں پر مقدمہ لکھا اور بہت اچھا لکھا، وہ کتابیں یہ ہیں: ''حجۃ الاسلام، اسلام مغربی دانشوروں کی نظر میں، القراءۃ العربیۃ اور تیسیر الانشاء''۔

آپ کی جب بھی کوئی کتاب آئی تو ایک نسخہ مجھے ہدیہ دیا، ابھی دو تین سال پہلے آپ کی دو کتابیں: متى تكون الكتابات مؤثرة؟ اور تعلموا العربية فإنها من دينكم، منظر عام پر آئیں، میرا آپ کے پاس جانا ہوا، مجھے دونوں کتابیں ہدیہ دیں، میں نے کچھ کلمات لکھنے کے لیے کہا تو آپ نے عربی میں لکھا: هدية إلى الأخ الفاضل الشيخ محمد ساجد القاسمي حفظه الله لقاء حبه للمؤلف اور نیچے اپنا نام تحریر کیا۔ ایک دن مجھے بلایا اور کہا ان دونوں کتابوں پر تبصرہ لکھ دو، میں نے کہا: ٹھیک ہے، لکھ دوں گا۔ میں نے دونوں کتابوں کو بالاستیعاب پڑھا اور دونوں پر عربی میں تبصرہ لکھا، جسے آپ نے پسند کیا اور ''الداعی'' میں شائع کیا۔

آپ کے چند اقوال

مولانا کے تجربات اور پرحکمت اقوال آپ کی عربی تحریروں بالخصوص ''اشراقۃ'' میں بکھرے ہوئے ہیں، بہت سی باتیں مجلس میں بھی اس قسم کی کیا کرتے تھے بطور مثال کے دو تین باتیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک فاضل دارالعلوم کا تذکرہ ہوا جو ایک بڑے ادارے میں مدرس تھے، پھر وہ اسے چھوڑ کر دوسرے ادارے میں چلے گئے۔ میں نے کہا کہ وہ بڑا ادارہ تھا اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے

تھا۔ تو فرمایا: معلوم نہیں، ان کے کیا حالات رہے ہوں گے؟ جن میں انھوں نے دوسرے ادارے میں جانے کا فیصلہ کیا۔ جب ہمیں ان حالات کا علم نہیں ہے تو ہمیں یہ بھی نہیں کہنا چاہیے۔ عربی کا جملہ فرمایا: وللغائب عذرہ۔ جو ہمارے سامنے نہیں ہے، نہ معلوم اس کے کیا حالات ہوں گے، جن میں اس نے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ فرمایا: اس اصول سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

ایک بار فرمایا: لوگوں کو ایک دوسرے سے ضرورتیں جوڑے ہوئے ہیں باہمی تعلقات کا نظام اسی پر قائم ہے۔ اگر ایک کی دوسرے سے کوئی غرض وابستہ نہیں ہوگی تو پھر تعلق بھی نہیں ہوگا۔

ایک بار میں نے کہا: فلاں ٹیلر دو مہینے میں کپڑے سل کر دیتا ہے اور وہ مہنگا بھی ہے۔ تو فرمایا جانتے ہو وہ کیوں ایسا کرتا ہے؟ وہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔

پھر آپ نے اپنا ایک واقعہ سنایا: دہلی میں ایک تنظیم کو عربی میں کوئی اہم تحریر لکھوانی تھی، اس نے مجھے دیوبند سے بلوایا (واضح رہے مولانا نے یہ سفر تعلقات کے لحاظ میں کیا ورنہ وہ اس طرح کے کاموں کے لیے سفر نہیں کرتے تھے) وہاں جا کر میں نے ان کا وہ تحریری کام تھوڑی دیر میں کر کے دے دیا۔ وہاں موجود ایک ملازم نے کہا: مولانا آپ نے یہ کام اتنی جلدی ان کو کر کے دے دیا، ان لوگوں کے دل میں اس کی قدر کیا ہوگی؟ کہیں گے یہ تو تھوڑی دیر کا کام تھا؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا اس کے بعد میں نے ان لوگوں کی بے التفاتی دیکھی۔

تالیفات ومضامین

آپ نے عربی اردو میں کتابوں اور مضامین کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ جو یقیناً آپ کے لیے صدقۂ جاریہ ہے، عربی مضامین کی ایک بڑی تعداد ''الداعی'' کی فائلوں میں موجود ہے، اگر ان کو موضوع وار ترتیب دیا جائے تو بہت سی کتابیں تیار ہو جائیں گی۔

آپ کی اردو کتابوں میں ''وہ کوہ کن کی بات، کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے؟ صہیونی وصلیبی جنگ، پس مرگ زندہ، فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں، حرف شیریں، رفتگان نارفتہ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جب کی عربی میں الصحابة ومكانتهم فی الإسلام، مجتمعاتنا المعاصرة والطريق إلى الإسلام، الدعوة الإسلامية بين دروس الأمس وتحديات اليوم، المسلمون فی الهند بين خدعة الديمقراطية وأكذوبة العلمانية، العالم الهندی الفريد: المقرئ محمد طيب القاسمی، مفتاح العربية ۱-۲، فلسطين فی انتظار صلاح دين، متى تكون الكتابات

مؤثرة؟، تعلموا العربية فإنها من دينكم، من وحی الخاطر ۱-۵، **اور** فی موكب الخالدين **(غیر مطبوعہ) قابل ذکر ہیں۔**

ان کتابوں کے علاوہ آپ نے بہت سی اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ان کے عربی ترجموں کے نام درج ذیل ہیں:

الدعايات المكثفة ضدَ الشيخ محمد بن عبد الوهاب **ازمولانا محمد منظور نعمانی**، الثورة الإيرانية فی ميزان الإسلام **از نعمانی**، الشيخ محمد إلياس الكاندهلوی ودعوته الدينية **از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی**، التفسير السياسی للإسلام **از مولانا ندوی**، سيدنا معاوية فی ضوء الوثائق والحقائق التاريخية **از مفتی محمد تقی عثمانی**، ما هی النصرانية؟ **از مفتی محمد تقی عثمانی**، قصة شاب هندوسی اعتنق الإسلام، الاشتراكية والإسلام **از خورشید احمد پاکستانی**، الدعوة الدينية وأسلوبها الأمثل **از امین احسن اصلاحی**، لالئ منثورة فی التعبيرات الحكيمة عن قضايا الدين والأخلاق والاجتماع **از مولانا اشرف علی تھانوی**، الإسلام والعقلانية **از تھانوی**، علماء ديوبند: اتجاههم الدينی ومزاجهم المذهبی **از قاری محمد طیب صاحب**، بحوث فی الدعوة والفكر الإسلامی **ازمولانا حسین احمد مدنی**،**اور** الحالة التعليمية فی الهند قبل عهد الاستعمار الإنجليزی وفيما بعده **ازمولانا مدنی۔**

آپ کی علمی ودینی خدمات کی بنا پر آپ کو۲۰۱۹ء میں ''صدر جمہوریہ ایوارڈ'' ملا جس میں تمغوں کے ساتھ ایک خطیر رقم بھی پیش کی گئی۔ دنیا کا کوئی اعزاز، تمغہ اور ایوارڈ ایک رمزی چیز ہے۔ خدمات کا حقیقی صلہ تو آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی عطا فرمائیں گے۔

مولانا کی زندگی بہت سبق آموز ہے، آپ نے کس طرح یتیمی اور ناداری کے عالم میں تعلیم کا آغاز کیا، آپ نے محنت کی، اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کیا اور ترقی کے منازل طے کیے۔ اہل علم نے آپ کی صلاحیت ولیاقت، آپ کی مہارت واختصاص کا اعتراف کیا اور حکومت نے بھی آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ''صدر جمہوریہ ایوارڈ'' دیا۔

سرخیٔ خارِ بیاباں یہ نشاں دیتی ہے کہ تیرے دیوانے کہاں سے کہاں تک پہنچے

❁ ❁ ❁

قافلۂ علم وادب کے عظیم سالار

حضرت مولانا نورعالم صاحب خلیل امینیؒ

(۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء = ۱۴۴۲ھ/۲۰۲۱ء)

از: مولانا مصلح الدین قاسمی
استاذ تفسیر وادب دارالعلوم دیوبند

شب سیاہ میں گم ہوگئی ہے راہِ حیات
قدم سنبھل کے اٹھاؤ بہت اندھیرا ہے

شبِ دوشنبہ ۲۰؍رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ مطابق ۳؍مئی ۲۰۲۱ء بوقت سحر معروف عالم دین درجنوں عربی واردو کتابوں کے مصنف ومترجم، صدرِ جمہوریہ ایوارڈ یافتہ دارالعلوم دیوبند کے استاذِ ادبِ عربی وچیف ایڈیٹر ماہنامہ ''الداعی'' حضرت مولانا نورعالم صاحب خلیل امینی اِس جہانِ آب وگل سے روپوش ہوکر اپنے رب کے جوارِ رحمت میں چلے گئے۔ إنّا للّٰہ وإنّا إلیہ راجعون.

شفقتِ پدری ومہر مادری کا مجموعہ

حضرت مولانا مرحوم نہ صرف یہ کہ راقم الحروف کے استاذ تھے؛ بل کہ زمانۂ طالب علمی میں شفقتِ پدری ومہر مادری کا مجموعہ تھے۱۴۱۵ھ مطابق ۱۹۹۵ء میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد اساتذۂ کرام کے مشورے سے ماہِ شوال میں جب شعبۂ ادبِ عربی میں داخلے کے ارادے سے دارالعلوم حاضر ہوا تو میرے نہایت مشفق استاذ محترم جناب حضرت مولانا اسعد صاحب(۱) ناظم

---

(۱) مولانا محمد اسعد صاحب: بانیِ دارالعلوم الاسلامیہ/بستی حضرت مولانا باقرحسین صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے بڑے فرزند ہیں، ۱۹۷۷ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ''جامعۃ الملک سعود/ ریاض'' میں عربی زبان وادب کی تعلیم حاصل کرکے ۱۹۷۹ء میں ''مدرسہ امدادیہ/ مرادآباد میں استاذ مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۲ء سے تاہنوز ''دارالعلوم الاسلامیہ/بستی'' سے درجۂ علیا کی کتابیں پڑھانے کے ساتھ بحیثیت ناظم انتظامی امور دیکھ رہے ہیں، وہاں سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالے ''فکر اسلامی'' کی ادارت بھی آپ ہی سے متعلق ہے، احقر کے نہایت مشفق اساتذہ میں سے ہیں، مطالع، تصنیف وتالیف اور نئی ونادر کتابوں کے حصول کے دلدادہ ہیں۔

دارالعلوم الاسلامیہ/بستی نے حضرت مولانا مرحوم کے نام ایک تحریر لکھ کر دیا جس کا مضمون غالباً کچھ اس طرح تھا:

''حاملِ رقعہ عزیزم مولوی مصلح الدین دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے ابنائے قدیم میں سے ہیں عربی ادب میں داخلے کے خواہش مند ہیں، سلیقہ منداور محنتی ہیں، اپنی تربیت میں رکھ کرتوجہ فرمائیں۔''

بہت دنوں تک یہ تحریر میں اپنے پاس رکھے رہا، تکمیل ادب کے لیے منتخب طلبہ کی لسٹ آویزاں ہوجانے کے بعد ایک دن وہ تحریر لے کر بعد نمازِ عصر حاضر خدمت ہوا، بس ملاقات وتعارف کا وہ دن تھا کہ جب تک دارالعلوم دیوبند میں بہ حیثیت طالب علم ومعین مدرّس رہا آپ کی شفقتوں کا تسلسل قائم رہا؛ بل کہ بعض دفعہ شفقت ومحبت کے ایسے مظاہر بھی دیکھنے میں آئے جو شفقتِ پدری اور مہر مادری کے مترادف رہے جنھیں احقر تازندگی فراموش نہیں کرسکتا، رب کریم آپ کو اس کا بہتر صلہ عطا فرمائے، آمین!

حقیقت یہ ہے کہ والدین اور افرادِ خانہ کے درمیان رہ کر جب بچہ تعلیم کی بسم اللہ کے لیے مکتب کا رخ کرتا ہے تب ہی سے اس کا احساس جاگنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسے تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے والے اساتذۂ کرام ہیں اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں، اس کی زندگی کا رخ متعین کرتے ہیں اور وہی اس کی ذات پر ایسے گہرے نقوش ثبت کرتے ہیں جنھیں نہ تو زمانہ مٹا سکتا ہے اور نہ فراموش کرسکتا ہے؛ بل کہ ہر ذی شعور انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اگر اس کے اساتذۂ کرام اس پر محنت نہ کرتے تو اس کی وہ شخصیت اور حیثیت نہ ہوتی جو ہے، اس کا دائرۂ نظر تنگ ہوتا، راہِ حیات میں اس کے قدم سست ہوتے اور ہر بلند مقصد کے حوالے سے وہ ہمیشہ پس روی کا شکار ہوتا، ایسا ہی کچھ احساس آج احقر کو اِن سطور کے قلم بند کرتے وقت ہورہا ہے:ـ

دیکھا نہ کوہ کن کوئی فرہاد کے بغیر
آتا نہیں ہے فن کوئی استاذ کے بغیر

ویسے تو انسان بہت سے اساتذہ سے پڑھتا اور علم حاصل کرتا ہے اور بہ حیثیت استاذ ہر ایک سے نہ صرف یہ کہ محبت کرتا ہے؛ بل کہ ان کی تعظیم وتکریم بھی کرتا ہے؛ مگر کچھ خاص اساتذہ ایسے ہوتے ہیں جن کی شاگرد پر چھاپ پڑجاتی ہے اور وہی اساتذہ اس کے مرکز ومحور بن جاتے ہیں، تعلیمی دورانیے میں جن چند اساتذۂ عظام کی احقر پر چھاپ پڑی اور جن سے بہت کچھ سیکھنے اور برتنے کا

شعور پیدا ہوا ان میں ایک جلی نام استاذ گرامی مرتبت حضرت اقدس مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ کا ہے۔

تمہارے نقشِ قدم سے ہم نے، ہزاروں اچھے خیال پائے
تمہارا دستِ شفیق تھاما، تو خود کو پھر ہم سنبھال پائے

تدریس وتربیت کا منفرد اسلوب

جس طرح آپ اپنے طرزِ بود وباش، رہن سہن، لباس وپوشاک اور تحریر واسلوبِ نگارش میں یکتا تھے ایسے ہی اندازِ تدریس وتربیت میں بھی بالکل منفرد تھے، کہنے کو تو آپ سے شعبۂ ادب عربی (تکمیل ادب) کا صرف ایک سبق ''النشر الجدید'' متعلق تھا؛ مگر وہ اتنا جامع سبق ہوتا تھا کہ ادب عربی سے متعلق طلبہ اس ایک گھنٹے کے لیے صبح سے تیار رہتے اور وہی گھنٹہ سب طلبہ کے دلوں پر حاوی رہتا تھا، تکمیلِ ادب میں داخل طلبہ کے علاوہ استفادے کے لیے دیگر طلبہ کی اتنی بڑی تعداد آجاتی کہ پوری درس گاہ پُر ہوجاتی، چوکھٹ اور باہر کے حصّے میں بھی طلبہ بیٹھے ہوئے نظر آتے۔

گھنٹہ شروع ہوتے ہی آپ درس گاہ میں داخل ہوجاتے اور سبق شروع فرمادیتے، باوجود اس کے کہ ہر طالب علم حتی الوسع عبارت کی بھرپور تیاری کرکے آتا، تاہم آپ کے آتے ہی ہر ایک سراسیمہ نظر آتا، نہیں معلوم عبارت خوانی کے لیے کس کا نام آجائے، آپ کے یہاں عبارت خوانی کے لیے ضروری تھا کہ ہر لفظ بالکل واضح، اعراب اور وجہِ اعراب پر پوری نظر رہے، اگر کسی لفظ کے اعراب میں غلطی ہوگئی تو پھر اللہ اکبر! امینی جاہ وجلال کا منظر قابلِ دید ہوتا، ہر ایک پر یہی خوف سوار ہوتا کہ کہیں میں زد میں نہ آجاؤں، اسی غیظ وغضب کے عالم میں کبھی فرمایا کرتے تھے: ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں ارکانِ شوریٰ کے سامنے یہ تجویز رکھوں کہ صرف انھیں فضلاء کو سندِ فضیلت دی جائے جو قرآن کریم کے کم از کم دو پارے (۲۹-۳۰) تجوید کے ساتھ پڑھنے اور لاعلی التعیین کسی عربی کتاب سے صحیح اعراب وترکیب کے ساتھ سنانے پر قادر ہوں، بقیہ کو صرف یہ تصدیق نامہ دے دیا جائے کہ دارالعلوم سے ان کا مرور ہوا ہے۔''

آپ درس کیا دیتے، عربی زبان وادب کا دریا بہادیتے، ایک ایک جملے کو مختلف تعبیرات میں ڈھال کر اِس انداز سے سمجھا دیتے کہ ہم طلبہ کے سامنے جدید تعبیرات کے کئی باب وا ہوجاتے، ہمیشہ کیفیت اور زبان سکھانے، تعبیرات استعمال کرنے کی باریکیوں پر آپ کا زور ہوتا، کوشش ہوتی کہ طلبہ کو کچھ لکھنا اور بولنا آجائے، کبھی فرماتے ''کسی زبان کو سیکھنے اور سکھانے کے لیے مقدار اور نصاب کا

پابند نہیں کیا جانا چاہیے۔''

چوں کہ حضرت مولانا نور عالم اپنے گرہ کُشا ورجال ساز شفیق استاذ حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانویؒ (متوفی ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء) کے مشفقانہ و مربّیانہ گود میں پلے بڑھے تھے اور انھیں کے سانچے میں ڈھلے تھے اس لیے آپ کا درس تعلیم اور تربیت دونوں کا مجموعہ ہوا کرتا تھا، آپ اپنے استاذ محترم کی طرح کتابِ علم کے ساتھ کتابِ حیات بھی پڑھا دیا کرتے تھے اور موقع بہ موقع حضرت کیرانویؒ کا حوالہ بھی دیتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ نے ابھی سبق شروع کیا اور کسی مناسبت سے جو رخ بدلا تو پورا گھنٹہ بامقصد زندگی کے اصول وآداب بتلانے میں گذر گیا، بےہنگم اور شائستہ دونوں طرح کی زندگی گذارنے والوں کی ایسی تصویر کشی کرتے کہ آپ کے حلقۂ درس میں بیٹھنے والے سعادت مند طلبہ کی عملی تربیت ہوجاتی؛ چناں چہ وہ حلقۂ درس سے اِس حال میں اٹھتے گویا ان کی زندگی کا دھارا بدل گیا ہو اور شائستہ و بااصول زندگی گذارنے کے لیے نہ صرف انھیں آمادہ کردیا گیا ہو؛ بل کہ ان کی روح کو تڑپا اور قلب کو گرما دیا گیا ہو، سچ ہے۔

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں

سعیِ پیہم پر زور

احقر کو تکمیل ادب اور تخصص فی الادب دو سال آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور آپ کی توجہِ خاص سے بہت کچھ سیکھنے اور برتنے کا موقع ملا، آپ کی طرف سے ہمیشہ یہ تاکید رہتی کہ ہر نئی تعبیر پر متعدد جملے لکھتے اور یاد کرتے رہو، آج اِن تعبیرات کو یاد کرلو گے تو کل یہی تمہارے الفاظ ہوجائیں گے، طلبہ سے کام لینے میں کبھی سخت گیر ہوجاتے، تمرین کی کاپیوں کی جانچ کرتے، جس دن کاپیاں طلب کرتے وہ دن بڑی آزمائش کا ہوتا، کوتاہی اور سستی کرنے والے سہمے ہوئے ہوتے، مطلوبہ کام پورا نہ ہونے کی صورت میں کاپیاں چاک کردیتے، سخت لب و لہجے میں ان پر برستے اور گاہ بہ گاہ اسی ناراضگی کے عالم میں درس گاہ سے اٹھ کر چلے جاتے، کلاس روم میں سنّاٹا چھا جاتا، یہ تنبیہ انتہائی مؤثر ہوتی، کوتاہی کرنے والے سارے طلبہ نئی کاپیاں لاکر راتوں رات بیدار رہ کر اپنے کاموں کی تکمیل کرتے اور پھر حضرت الاستاذ کو سال بھر اِس انداز سے تنبیہ کی ضرورت پیش نہ آتی۔

تخصّص فی الادب کے سال پڑھاتے وقت اپنے استاذ محترم حضرت کیرانوی علیہ الرحمہ کا بارہا

حوالہ دیتے ہوئے فرماتے کہ تخصص صرف عربی زبان پڑھنے لینے کا نام نہیں ہے؛ بل کہ میرے طرزِ عمل اورانداز کوبھی دیکھو کہ میرے لکھنے کا طریقہ کیا ہے؟ میں وقت کوکیسے کام میں لاتا ہوں؟ میرے مطالعہ گاہ میں لکھنے کے دوران کون کون سی معاون کتابیں اورلغات رہتی ہیں؟ نیز فرماتے: ''کسی بھی مضمون اورتحریرکومرتب کرتے اور لکھتے وقت یہ بات پیش نظر رہے کہ بار بارلغت کی مراجعت ہو، خواہ وہ لفظ تمہیں یاد ہی کیوں نہ ہو'' اورمزاحاً فرماتے: ''جولفظ یاد ہواورجس پر اعتماد ہواُسے تو ضرور دیکھو خواہ وہ لفظ دیکھو یانہ دیکھو جو یاد نہ ہواورجس میں شبہ ہو'' اس لیے کہ جس لفظ میں انسان کوشبہ ہوتا ہے اور جو یادنہیں ہوتا اُسے تو دیکھتا ہی ہے۔

جہد مسلسل اور دقّت نظر پیدا کرنے پر بہت زور دیتے اورفرماتے: ''لاپرواہ طلبہ سبق سے اٹھنے کے بعد کمروں میں جاکر طرح طرح کے منصوبے تو بناتے ہیں مگر کام وہی کرتے ہیں جن میں اطاعت اورمحنت کا فطری جذبہ ہوتا ہے'' اسی انداز کی ایک درسی تقریر میں تخصص فی الادب کے سال تمرین کے لیے کچھ اس طرح کے جملے لکھوائے:

> ''کسی مقصد کے حصول کے لیے محض شیریں تمنّائیں کافی نہیں؛ بل کہ جہدِ مسلسل کی ضرورت ہے، بے پناہ کوشش، صبر اورتوکل کے ذریعے ہی کسی مقصد کوحاصل کیا جاسکتا ہے، بہت سے نوجوان بڑے بڑے مقاصد کے حصول کی محض تمنّا تو کرتے ہیں؛ لیکن سعی وعمل سے جی چراتے ہیں، کیوں کہ عمل ایک تلخ گھونٹ ہے جو ہر ایک کو پسند نہیں آتا، جب کہ آرزو ایک خوشنما جنت ہے جس کی سیر ہر ایک کے لیے آسان ہے؛ لیکن خدائے حکیم نے اِس کائنات کے نظام کوحرکت وعمل سے مربوط کیا ہے، خواب وآرزو پر اس کی اساس قائم نہیں کی۔''

منزل کی تمنّا ہے تو کر جہدِ مسلسل
میراث میں تو چاند ستارے نہیں ملتے

تحقیق وتصنیف میں بے نظیر

قسّامِ ازل کی طرف سے آپ کوتحقیق وتصنیف کا بے نظیر ذوق اوروافر حصہ ملا تھا، اِس میدان میں حضرت مولانا مرحوم نے اپنے آپ کو بہت کھپایا تھا، جس کی وجہ سے عالم اسلام کے نامور اور صاحبِ طرز ادباء واصحابِ قلم میں آپ کا شمار ہوتا تھا، آپ کی نظر نہ صرف ہندوستانی سیاست اور متعصب ہندوؤں کی جانب سے پیش آنے والے مظالم پر تھی؛ بل کہ عالم اسلام میں رونما ہونے

والے واقعات پر بھی آپ کی گہری نظر رہتی تھی اور اپنی تحریروں میں ہمیشہ اس پر روشنی ڈالتے تھے، سیاسی، اسلامی اور تعلیمی وتربیتی عناوین پر لکھنے کے ساتھ ہندوستان، فلسطین، مسجد اقصیٰ، امریکہ وعراق اورامریکہ و افغانستان کے مابین ہونے والی جنگوں کی صورت حال پر "لیعلمنّ بوش تاجر الحروب أنّ الظّلم مرتعه وخيم" (جنگوں کے بیوپاری بش کو ضرور بالضرور پتہ چل جائے گا کہ ظلم کا انجام براہوتا ہے) اور "سجِّلْ يا تاريخ واشهَدْ يا زمان" (اے تاریخ! نوٹ کر اور اے زمانہ! گواہ رہ) جیسے حسّاس موضوعات پر لکھ کر اپنی دینی حمیت کا ثبوت پیش کیا۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

آپ کی تمام تحریریں نفاستِ زبان، برجستگی، روانی اور حلاوت وجاذبیت کا نمونہ ہوتی تھیں، جس موضوع پر بھی لکھتے بڑی تحقیق وجستجو کے بعد ہی قلم اٹھاتے، مضامین میں ذکر کردہ تاریخ اورسن وغیرہ کو بڑی دقت نظری سے دیکھتے اور لکھتے، علم وتحقیق کے باب میں عرق ریزی آپ کا لذّت انگیز مشغلہ تھا، اِس راہ آپ جتنا پریشان ہوتے اتنا ہی آپ کو مزہ آتا، چناں چہ تحقیق وجستجو کا پر پیچ اور دشوار گذار سفر آپ کے لیے آسان ہوگیا تھا، آپ کی ہر تحریر آپ کی دقیقہ رسی اور ژرف نگاہی پر غماز ہے۔

عالم اسلام میں دارالعلوم کی بے مثال ترجمانی

دارالعلوم دیوبند میں آپ کی خدمت کا دورانیہ تقریباً چالیس سال ہے، اِس دوران عربی زبان کی نہایت کامیاب اور مثالی تدریس کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے عربی ماہنامہ ''الداعی'' کے پلیٹ فارم سے آپ نے جو خدمات انجام دیں اور اپنی تحریر وتعریب کے ذریعے پورے عالم اسلام کو نہ صرف یہ کہ اکابر دیوبند کے علوم ومعارف سے روشناس کرایا اور مسلکِ دارالعلوم کی ترجمانی کی؛ بل کہ دارالعلوم دیوبند اور ملّت اسلامیۂ ہند پر گذر رہے احوال وکوائف سے بھی ہمیشہ باخبر رکھا، آپ کا یہ کارنامہ اور بے نظیر کوشش دارالعلوم کی نشأۃ ثانیہ کا ایک اہم باب ہے۔

ماہنامہ ''الداعی'' کے مشمولات کو عمدہ سے عمدہ تر بنانے میں آپ کو ازحد دلچسپی تھی، حالات اور وقت کے تقاضے کے مطابق اسے ظاہری ومعنوی اعتبار سے سنوارنے اور دیدہ زیب بنانے پر پوری توجہ دیتے تھے، عالم اسلام کے ابھرتے ہوئے مسائل اس انداز سے لکھتے اور ترتیب دیتے کہ باذوق قارئین کو رسالے کا انتظار رہتا تھا، آپ نے ماہنامہ ''الداعی'' کو عربی وعلمی مجلّات کے مابین دارالعلوم دیوبند کے شایانِ شان مقام عطا کیا، نتیجتاً عرب علماء ودانشوران بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے،

چناں چہ سعودی عرب کے وزیرتعلیم عبدالعزیز بن عبداللہ الخویطر نے "الدّاعی مجلّةٌ تستحق أن تُقرأ" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھ کر نہ صرف یہ کہ رسالے کی اہمیت کا اقرار کیا؛ بل کہ دیگر لوگوں کو بھی پڑھنے کی تاکید کی، موصوف کا یہ مضمون محرم الحرام ۱۴۲۳ھ کے شمارے میں شائع بھی ہوا۔

اکابر دارالعلوم سے سچی عقیدت

حضرت مولانا مرحوم کو دارالعلوم اور اکابرِ دارالعلوم سے بے پناہ عقیدت تھی، بالخصوص حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کا تو تذکرہ کرتے وقت آپ کی حالت بدل جاتی، سلسلۂ کلام دراز ہوجاتا، فرماتے کہ: ''علماء کو حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کو ضرور پڑھنا چاہیے'' حضرت تھانویؒ کے بے شمار ملفوظات واقوال زبان زد تھے، سناتے اور باریکیوں پر روشنی ڈالتے، بانیینِ دارالعلوم کے اخلاص وللّٰہیت کا تذکرہ غایتِ عقیدت ومحبت سے کرتے، لکھتے تو قلم رواں ہوجاتا، آج بھی ''الداعی'' کے ''دارالعلوم نمبر'' میں آپ کے قلم کی روانی اور جولانی کو دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے: ''رقبے کے اعتبار سے دنیا میں نہیں ہندوستان ہی میں اس سے بڑے ادارے مل جائیں گے؛ مگر دارالعلوم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے داخلے کے لیے جتنی آہیں بھری جاتی ہیں اور جتنے آنسو بہائے جاتے ہیں دنیا کے کسی بھی ادارے کو مثال میں پیش نہیں کیا جاسکتا'' کبھی فرماتے: ''دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کو جو عقیدت دارالعلوم سے ہے وہ دوسرے ادارے کے فضلاء کو اپنے اداروں سے نہیں ہوسکتی'' ایک مرتبہ فرمانے لگے: ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں لکھوں کہ دارالعلوم کی کچی اینٹوں میں جو شہنشاہیت پوشیدہ ہے وہ بادشاہوں کے محلات میں بھی نہیں مل سکتی'' سچ ہے۔

عابد کے یقیں سے روشن ہے سادات کا سچا صاف عمل
آنکھوں نے کہاں دیکھا ہوگا اخلاص کا ایسا تاج محل
کہسار یہاں دب جاتے ہیں طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اِس کاخِ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

اوقات کی پابندی

پابندیِ اوقات آپ کا شیوہ اور آپ کی شخصیت کی شناخت تھی، دارالعلوم میں ظہر کے بعد کے دو گھنٹوں (ساعتِ پنجم وششم) کا سبق آپ سے متعلق تھا، احقر تخصص فی الادب کے سال معمولاً آپ کو لینے کے لیے جاتا، ہمیشہ آپ کپڑے، پالش دار جوتے، موزے اور شیروانی پہن کر تیار رہتے، کبھی

اس میں تخلّف نہیں دیکھا، وقت پر سبق شروع کرتے اور ٹھیک وقت پر پورا کردیتے، طلبہ کو بھی سختی سے وقت پر پہنچنے اور وقت کو کام میں لانے کی تاکید کرتے اور فرماتے: ''زندگی میں اگر وقت کی پابندی کروگے تو خود بھی مشقت و پریشانی سے محفوظ رہوگے اور دوسروں کو بھی اس سے راحت رہے گی''۔

وقت کو زندگی کا عظیم سرمایہ سمجھنے کی وجہ سے ہی بڑی گراں قدر اور نادر کتابیں تصنیف کیں جو بلاشبہ آپ کے لیے ذخیرۂ آخرت ہیں۔

تدریسی و تصنیفی خدمات

حضرت مولانا مرحوم کی تدریسی و تصنیفی فتوحات واکتسابات کا دائرہ بہت وسیع ہے، ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۲ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ۱۹۸۲ء سے اپریل ۲۰۲۱ء تک دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب کے مثالی معلّم کی حیثیت سے آپ نے درس وتدریس کا جو جام لنڈھایا اور اپنی علمی وادبی تحریروں سے جس طرح تشنگانِ علوم کو سیراب کیا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

آپ نے متنوع موضوعات پر مقالات ومضامین لکھنے کے ساتھ عربی زبان میں ''الصحابة ومكانتهم في الإسلام، مجتمعاتنا المعاصرة والطريق إلى الإسلام، الدعوة الإسلامية بين الأمس واليوم، العالم الهندي الفريد: الشيخ المقرئ محمّد طيب، فسلطين فى انتظار صلاح دين، مفتاح العربية (جزءان)''، اور اردو زبان میں: ''وہ کوہ کن کی بات، حرف شیریں، صحابۂ رسول اسلام کی نظر میں، موجودہ صلیبی صہیونی جنگ.. حقائق اور دلائل، عالم اسلام کے خلاف حالیہ جنگ.. کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے؟ فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں، خط رقعہ کیوں اور کیسے سیکھیں''۔ جیسی اہم اور کارآمد کتابوں سے اسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا۔

آج ہر چند کہ حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ ہمارے درمیان نہیں رہے؛ لیکن آپ کی تصانیف کی میراث بہرحال ہمارے درمیان باقی ہے جو آپ کے لیے بہترین صدقۂ جاریہ ہیں، یہی وہ حقیقی میراث ہے جس سے نہ صرف یہ کہ ہم سب فائدہ اٹھا سکتے ہیں؛ بل کہ ان کی یاد کو قائم ودائم رکھ سکتے ہیں اور ان سے مستفید ہوکر تعلیم وتربیت کے میدان میں مفید سے مفید تر بن سکتے ہیں۔

رب کریم حضرت مولانا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، لغزشوں کو درگذر فرمائے اور علّیین میں مقام بلند عطا فرمائے، آمین!

❁ ❁ ❁

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ

شخصیت اور انفرادیت

بہ قلم: مولانا اشرف عباس صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

۱۹-۲۰؍رمضان المبارک کی درمیانی شب میں استاذِ گرامی مربی نسل نو حضرت مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال پر ملال ذہن ودماغ کو مضمحل کردینے والا ایسا زبردست حادثہ ہے جس کی کسک علمی ودینی حلقے میں دیر تک محسوس کی جاتی رہے گی اور اس زخم کے مندمل ہونے میں نہ جانے کتنا عرصہ لگے! إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ما أخذ ولہ ما أعطی، وکل شیء عندہ بأجل مسمی.

حضرت الاستاذ عربی اور اردو کے صاحبِ طرز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مثالی معلم، بے نظیر مربی اور جامع کمالات تھے؛ ہم جیسے طالب علموں کو آپ کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں نے متاثر کیا، اور ان میں سے ہر پہلو تفصیل سے لکھے جانے کا متقاضی ہے؛ تاہم زیر نظر مضمون میں صرف بعض اشارات پر اکتفا کیا جارہا ہے جن سے شخصیت کی جامعیت وعبقریت سامنے آسکے گی۔

۱- عربی زبان سے عشق

رسول کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی مبین سے والہانہ عشق، جذباتی وابستگی، زبان وقلم سے اس کی تعلیم واشاعت کے لیے اپنا سب کچھ تج دینے کا بے پناہ جذبہ آپ کی زندگی کا نمایاں وصف ہے، اور زبان کے ساتھ یہ شیفتگی محض زبان کی حیثیت سے نہیں؛ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال محبت اور کتاب وسنت کے ساتھ انتساب نے آپ کو اس پاکیزہ زبان کا ایسا اسیر بنادیا تھا کہ زندگی بھر اسی کی زلفیں سنوارتے رہے، طلبہ کے ساتھ آپ کا اختلاط بہت کم تھا، اور آپ اپنے مصروف نظام الاوقات کی وجہ سے عموماً طلبہ کی انجمنوں اور پروگراموں سے گریزاں رہتے تھے، اس لیے عام

طلبہ کے ذہن و دماغ میں آپ کا تصور فقط ایک عام ادیب اور باکمال قلم کار کی حیثیت سے ہوتا تھا؛ لیکن تکمیل ادب عربی میں آپ سے شرفِ تلمذ حاصل کرنے کے بعد آپ کی اصلی شخصیت کھل کر سامنے آتی، آپ کی ادبیت کے ساتھ صالحیت اور جذب دروں کا قلب پر ایسا نقش قائم ہوتا کہ وہ بھی شریک زمرہ لایحزنوں ہوجاتا۔ ۲۰۰۰ء میں جب عربی ادب میں ہمارا داخلہ ہوا تو دو چار روز آپ ہمارے قلب ونظر کی تطہیر، نیت کی درستگی، عربی زبان کے حوالے سے شہید جستجو بن جانے اور اعلی اخلاق واقدار اختیار کرنے پر ایسی مؤثر گفتگو فرمائی کہ ہم میں سے بہت سوں کے قلبی جذبات آنسوؤں کی راہ سے باہر نکل آئے، ایک ممتاز ساتھی میرے کان میں کہنے لگے: ''یہ عام ادیب ومصنف نہیں بلکہ صلاح وتقوی اور سوزِ دروں کے اعتبار سے الگ ہی شخصیت ہیں'' اور پھر سال بھر یہ شخصیت اپنے اسی خاص رنگ وانداز میں زبان وادب کی حلاوت کے علاوہ طیبہ کی مئے محبوب بڑی فیاضی کے ساتھ ہمیں پلاتے رہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مقدس کے ساتھ والہانہ تعلق کا نتیجہ تھا کہ اس کی خدمت آپ کی زندگی کی سب سے بڑی شناخت بن گئی۔

۲- حسن خط

آپ ایک نستعلیقی مزاج کے باوقار اور ذکی الحس عالمِ دین تھے، نشست و برخاست، رفتار و گفتار اور لباس و پوشاک غرضیکہ ہر چیز میں منفرد جمال پسند انداز تھا، کسی بھی کام کو انتہائی سلیقہ مندی اور خوش اسلوبی سے انجام دینے کا مزاج رکھتے تھے، چنانچہ عربی کے ایک بڑے قلم کار ہونے کے ساتھ جودت خط اور مختلف اسالیب کتابت کے بھی بڑے ماہر تھے۔ کسی زبان میں مہارت کے ساتھ خط کی عمدگی کبھی کبھار ہی جمع ہو پاتی ہے، اور بہت سے مشاہیر بھی اس خوبی سے محروم رہے ہیں۔ عبدالحمید الکاتب نے واضح کیا ہے کہ بیان وفصاحت کا تعلق زبان کے ساتھ انگلی کے پوروے سے بھی ہے جس سے قلم پکڑا جاتا ہے، مشہور ادیب مبرد نے بدنما خط کو ادب کا بانجھ پن اور عیب قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ عربوں میں ایک کہاوت رائج ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ سبز پتے میں لپٹے ہوئے تازہ پھل کی خوبصورتی سفید کاغذ پر بکھرے ہوئے شان دار خط کے سامنے ہیچ ہے۔ (فتح القدیر شرح الجامع الصغیر ۳/۵۰۵)

حضرت مولاناؒ شروع ہی سے حسن خط اور خوش نویسی کے حوالے سے ممتاز رہے، اور دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے ہوئے مختلف مداخل ومخارج پر آپ کی نمایاں تحریر آویزاں کی جاتی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خاص توجہات کو اپنی طرف منعطف کر

وانے میں اس وصف کا بھی خاص دخل رہا ہے، بدنما اور کج مج تحریر سے آپ کو بڑی اذیت ہوتی، ہم جیسوں کی کاپی چیک کرتے وقت، مزاج سے ہم آہنگ خط نہ ہونے کی صورت میں بڑی خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے اور اسے کبھی تو خط خرطوم اور کبھی خط لاقانونی کا نام دیتے تھے، اور بالخصوص خط رقعہ کی غیر معمولی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے تھے، آپ نے اپنی بعض تحریروں میں اس سخت موقف کی کھل کر وکالت کی ہے: چناں چہ فرماتے ہیں:

''حسن خط انسان کا بہت خوبصورت زیور ہے، کسی پڑھے لکھے شخص کے لیے زیبا نہیں کہ وہ بد خطی کے مرض میں مبتلا ہو، اگر خدانخواستہ مبتلا ہو تو اسے ''زود اثر دواؤں'' کے ذریعے اس کا ازالہ کرنا چاہیے۔''

اس سلسلے میں باضابطہ آپ نے طلبہ کی رہنمائی کے لیے مستقل کتاب ''خط رقعہ کیوں اور کیسے لکھیں''بڑے اہتمام سے مرتب کر کے شائع بھی کی۔

۳- قواعدِ املا کی تعلیم

حسن خط، کسی زبان کو لکھنے کی معیاری اور جاذب نظر صورت کا نام ہے، اور اس خط کے مطابق صحت کا اہتمام کرتے ہوئے لکھنے کا نام املا ہے، بہت سے قلم کار علامات وقف اور رموز املا کا خاص خیال رکھتے ہیں، جس سے قاری کی رسائی بہ آسانی مضمون نگار کی مراد تک ہو جاتی ہے اور وہ کسی الجھاؤ کا شکار ہوئے بغیر مضمون کی خواندگی سے فائدہ اٹھاتا اور لطف حاصل کرتا ہے، حضرت مولاناؒ کے یہاں اس کا بڑا التزام تھا، ایک مقام پر صحتِ املا کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نویسندہ ایک لفظ کو اس کے املا کے برخلاف لکھ کر ایک باذوق قاری کو ایک طرح کی الجھن میں ڈال دیتا ہے، بلکہ اسے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اسے اس لفظ کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ پڑھ لے، جو نویسندہ کا مقصود نہیں ہوتا''

واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اساتذہ میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس پہلو پر توجہ دینے والا حضرت مولانا کو ہی پایا، آپ نہ صرف یہ کہ زندگی بھر اپنی تحریروں میں شدت کے ساتھ اس کا التزام کرتے رہے؛ بلکہ اپنے شاگردوں کی بھی ہمیشہ اس حوالے سے ذہن سازی فرماتے رہے۔ آپ اس موضوع پر بڑی تفصیل اور اہتمام کے ساتھ روشنی ڈالتے تھے، آپ ہی کی ترغیب وتحریض پر رشید احمد صدیقی کی مفصل کتاب ''اردو املا کیسے لکھیں''اور گوپی چند نارنگ کے مختصر رسالے ''املا نامہ'' پڑھنے کا موقع ملا، آپ ان دونوں کتابوں کے بہ کثرت حوالے دیتے تھے، طلبہ کی صحیح رہنمائی کے لیے آپ نے

''حرف شیریں'' میں رہنما اصول بڑی خوبی اور جامعیت کے ساتھ جمع کردیے ہیں۔

۴- تدریس کا خاص نہج

آپ کا انداز روایتی تدریس سے خاصا مختلف تھا۔عبارت خوانی میں نحو وصرف کی رعایت کافی نہیں تھی؛ بلکہ طالب علم کو عربی کے تمام قواعد کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا، جس سے صحیح مخرج سے حروف کی ادائیگی اور قواعدِ وقف کے التزام کی عادت پڑ جاتی تھی؛ حضرت مولانا گنتی کے چند چوٹی کے ادبا میں شمار ہوتے تھے؛ لیکن آپ ہمیشہ طلبہ کی سطح کا خیال رکھتے ہوئے اس طرح پڑھاتے تھے کہ اس سے سارے طلبہ خوب مستفید ہوتے اور ہر ایک کا یہ تصور ہوتا کہ یہ درس مجھے ہی سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔تکمیل ادب کے طلبہ کو صرف ایک گھنٹہ پڑھاتے تھے؛ لیکن مختلف انداز سے مشق وتمرین کے ذریعے ایسا نہج دے دیتے کہ اس سے منزل تک رسائی کی راہیں کھل جاتیں۔آپ کے طاقت ور جملے، لطافت وظرافت سے بھرپور تمثیلات، برمحل اشعار وتلمیحات اور خاص انداز واشارات طلبہ کو اس طرح گرویدہ بنالیتے کہ وہ قلب اور قالب دونوں کے ساتھ ازاول تا آخر درس گاہ میں حاضر رہتے، اور یہ بھی آپ کا ممتاز وصف تھا کہ دوران درس مختلف علمی فکری اور فنی کتابوں اور مراجع کی نشان دہی فرماتے؛ چنانچہ پہلی بار آپ ہی کی ترغیب پر ''پرگتی میدان'' دہلی میں منعقد ہونے والے عالمی کتاب میلے میں حاضری ہوئی اور اپنے مطلب کی کئی کتابیں خرید لایا۔ ہر سال حضرت کا معمول اس کتاب میلے میں شرکت کا تھا۔

۵- ذکرامت فکرامت

ملکی اور عالمی حالات پر گہری نظر تھی، اسلام کی محدود دعوتی واصلاحی کوششوں اور ان کے بعض صالح اثرات کے ساتھ صہیونی اور استبدادی تحریکوں اور ان کے منفی اثرات پر آپ انتہائی بابصیرت تبصرے کرتے تھے، ملت کی زبوں حالی اور اس کے لیے صحیح راہِ عمل کی نشان دہی میں آپ نے عمر کھپا دی، آپ کے قلم کا رخ قضیہ فلسطین اور مسجدِ اقصی کی طرف بہ کثرت رہا ہے۔

صحیح معنی میں آپ اسلامی افکار وخیالات سے لیس ایک بہترین قلم کار تھے، آپ کا کوئی اداریہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں آپ نے اپنا سینہ چیر کر نہ رکھ دیا ہو، آپ کے قلم نے زبردست آنسو نہ بہائے ہوں اور اپنے قاری کو نہ رلایا ہو۔ان کے علاوہ آپ کے گہر بار قلم سے نکلنے والی نادر وفکر انگیز کتابیں جیسے، ''کیا اسلام پسپا ہورہا ہے؟''، ''موجودہ صلیبی صہیونی جنگ''، ''فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں''۔آپ کی عالم اسلام کے تئیں ہمدردی اور فکرمندی کا بین ثبوت ہیں۔

آپ کا قلم اخلاص وللّٰہیت کے نور سے منور اور عشق ومحبت اور سوز دروں کی حرارت سے لبریز تھا، آپ کا خیال تھا کہ انشاء پردازی اگر تقوی وطہارت کے نور سے خالی ہو تو اس میں وہ تاثیر اور جاذبیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ "متی تکون الکتابات مؤثرة" میں بڑے موثر انداز میں آپ نے یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ الفاظ وحروف کی حیثیت جسم کی ہے، اصل روح قلم کار کا سوزِ دروں اور جذبہ اخلاص ہے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''کوئی عالم، مصنف، اہل قلم، داعی، فقیہ، محدث، قائد دینی، مصلحِ اجتماعی؛ بل کہ ادیب، شاعر اور فن کار؛ خواہ کتنا ہی قد نکال لے، وہ محض علم واطلاع کے بل بوتے پر اور صرف ذہانت وذکاوت، عقل وعبقریت، دور نگاہی وروشن خیالی کے سہارے اپنے کام میں برکت کا نور، مقبولیت کی سحر کاری، قدر افزائی، تب وتابِ اخلاص، بے تابیٔ عشق رسول، سرشاری محبت الٰہی، لذتِ سحر خیزی، ذوقِ عبادت اور شوقِ ریاضت سے نہ اٹھا ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو کسی عمل کو صاحب عمل کے لیے اور خلق خدا کے لیے ذریعۂ فائدہ رسانی اور باعثِ حیاتِ جاودانی بنادیتی ہے۔''

درس میں بھی موقع بہ موقع موجودہ احوال وکوائف پر اپنے کرب کا اظہار فرماتے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتے: أنا لست بمتشاؤم بمستقبل أمة الإسلام. اس لیے طلبہ درسگاہ میں آپ سے صرف عربی ہی نہیں سیکھتے تھے؛ بلکہ ان میں دل دردمند ملت کے لیے فکرمندی اور اس کے مسائل کے مختلف جہات سے واقفیت اور فکر ونظر کی آفاقیت بھی منتقل ہوتی تھی۔ صہیونیت کے بارے میں تھوڑا بہت پہلے پڑھ رکھا تھا لیکن تکمیل ادب کے سال آپ کی رہنمائی سے موضوع کی مختلف گرہیں کھلتی گئیں اور آپ ہی کی نشان دہی پر اور اس جیسی اصطلاحات کی حقیقت سے واقفیت کے لیے ''فرہنگ سیاست'' جیسی کتابوں سے بھی خوب استفادہ کیا۔

۶- دارالعلوم اور مسلک دارالعلوم سے تعلق اور ترجمانی

دارالعلوم دیوبند سے محبت وعقیدت آپ کے رگ وریشے میں پیوست تھی؛ بلکہ آپ زندگی بھر اس کے فکر ومشن کے ترجمان رہے، درس کے دوران اور نجی مجلسوں میں سلف صالحین اور اکابر علماء دیوبند کی خدمات اور کارنامے ایسے مؤثر انداز میں ذکر کرتے کہ دلوں پر ان کی عظمت کے نقوش مرتسم ہوجاتے، آپ کی بڑی خواہش تھی کہ اکابر علماء دیوبند کے علوم وافکار سے عالم عرب کو بھی واقف کرایا جائے؛ چنانچہ آپ نے اس کے لیے کامیاب عملی کوششیں کیں اور الداعی کے صفحات پر حضرت تھانوی ودیگر اکابر علماء دیوبند کے تراجم اور قیمتی تراشوں کے شائع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا جو بعد میں کتابی

شکل میں بھی شائع ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند کے مسلک کی ترجمانی وتشریح بھی اپنے زبان وقلم سے مثبت اور ٹھوس انداز میں کرتے رہے۔ حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیبؒ کی مشہور کتاب ''علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' کوشان دار عربی کے قالب میں آپ ہی نے ڈھالا ہے۔

۷- ادبی امتیاز

علمی طبقے میں یہ بھی آپ کا خصوصی امتیاز ہے کہ آپ عربی اور اردو زبان وادب کے حوالے سے اپنی ایک خاص شناخت رکھتے تھے، چناں چہ دونوں ہی زبانوں میں آپ نے جو قابل قدر لسانی و ادبی سرمایہ چھوڑا ہے اس کی مثال تقریباً ناپید ہے، دونوں زبانوں کے ادبا اور قابل فخر شخصیات نے آپ کا لوہا مانا، اور آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے ۔ عربی کی طرح اردو میں بھی آپ کا خاص اسلوبِ نگارش رہا ہے، عموماً آپ کے جملے، درمیان کے وضاحتی بیان کی وجہ سے طویل ہوتے ہیں؛ تاہم اپنی معنویت، استدلالی انداز اور رموز املا کی خاطر خواہ رعایت کی وجہ سے قاری پر ایسا اثر چھوڑ جاتے ہیں کہ وہ اس کے سحر میں کھو جاتا ہے، مولانا کے جذبے کی صداقت اور طاقتور طرز نگارش کی دھمک کو قلب ونظر کی گہرائی میں اترتا ہوا محسوس کرتا ہے، ذیل میں دیکھیے وہ کس خوبی کے ساتھ موثر انداز میں مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح کی باعظمت شخصیت کا ہالہ اپنے قاری کے ذہن ودماغ کے ارد گرد تیار کرتے ہیں:

''میں نے صرف اردو میں نہیں عربی میں بھی تحریر کے بادشاہوں کو پڑھا ہے، تقریر کے جادوگروں کو سنا ہے، الفاظ کے شہنشاہوں کو برتا ہے، فصاحت وبلاغت کے دریا بہانے والوں کا تجربہ کیا ہے، مطالعہ ومعلومات کی گم نام اور تاریک سرنگوں میں، بے خطر بہت دور تک چلے جانے والے، بہت سے لوگوں کا علم ہے؛ لیکن دل کی اتھاہ گہرائیوں سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تحریر وتقریر کے لفظ لفظ نہیں، حرف حرف پر اور ہر زیر وبم پر خلوص کا جو حسن، ایمان ویقین کی جو مہر تابی، درد دل کی جو لذت، انسانوں سے محبت کا جو جمال، اعلائے کلمۃ اللہ کا جو جلال، صدائے حق کی جو دل نوازی، اور سوزِ دروں کی جو تمازت اور فقر غیور وزہد پرنور کی جو جاذبیت وحرارت، میں نے مولانا علی میاں کے ہاں محسوس کی ہے، وہ میرے محدود علم ومطالعہ میں، ان میں سے کسی کے ہاں اس بھرپور کیفیت اور طرز خاص کے ساتھ نہیں ملتی''۔ (پس مرگ زندہ، ص:۵۴۱)

مولانا نے شاعری نہیں کی ہے؛ البتہ بعض شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تبصرے سے واضح ہے کہ سخن فہمی کی اعلیٰ صلاحیت، گہری بصیرت اور بالغ نظری عطا ہوئی تھی، مفتی کفیل الرحمٰن نشاط

عثمانی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے لکھا تھا: ''مفتی کفیل الرحمٰن نشاط کے اشعار، رواں دواں اور پیہم جواں زندگی کے نت نئے مسائل کی ترجمانی میں لب ولہجہ، انداز وادا اور رنگ وآہنگ کے تعلق سے اپنی مخصوص طرح رکھتے ہیں، زندگی کی کامرانیوں اور فیض بختیوں اور اس کی ناقابل تلافی ناکامیوں اور محرومیوں دونوں کی نقشہ گری اپنے اشعار میں لاجواب انداز میں کرتے ہیں، ان کے اشعار کا بغور مطالعہ کیجیے اندازہ ہوگا کہ وہ شاعر کی پاکیزہ نفسی، روح کی شفافیت، احساس کی نزاکت، تخیل کی بلندی، مسائل حیات کے احاطے اور کائنات کی سچائیوں کی ہمہ گیر تعبیر پر شاہد عدل ہیں۔'' (ایضاً،ص:۹۴)

آسام یونی ورسٹی سے آپ کی کتاب ''فلسطین فی انتظار صلاح دین'' اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے آپ کی زیر ادارت شائع ہونے والے مجلّے ''الداعی'' پر آپ کے فکروفن اور ادبی وسماجی شعور کے مطالعے کے تناظر میں ڈاکٹریٹ کے مقالات تحریر کیے جاچکے ہیں، علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند کی طرف سے باوقار صدر جمہوریہ ایوارڈ بھی آپ کو تفویض کیا جاچکا ہے۔

۸- اپنی دنیا آپ پیدا کی

بہت سے حضرات اپنی خاص نسبتوں اور وسائل کے سہارے کامیابی کی منازل طے کرتے ہیں، لیکن مولانا کا معاملہ یکسر مختلف رہا ہے۔صغر سنی میں ہی یتیمی کا درد جھیلنا پڑا، والدہ محترمہ کا دوسرا نکاح ہوجانے کے سبب ان کی خصوصی توجہات سے بھی محروم ہوگئے، اس طرح نامساعد اور صبر آزما حالات کے باوجود توفیق ایزدی سے ایسے سخت جان اور پرعزم واقع ہوئے تھے کہ کبھی ہار نہیں مانی، سمندر پاٹنے اور کوہ سے دریا بہانے کے حوصلے کے ساتھ آگے بڑھے اور بڑھتے چلے گئے، آپ نے ایک بار دوران درس بڑے جذبات کے ساتھ فرمایا تھا: ''میں نے افلاس کے چراغ سے علم کی روشنی حاصل کی ہے۔''

کچھ عرصے قبل گھر پر حاضری ہوئی، تو فرمانے لگے:

''مولانا! میں کھیتی کے کام سے خوب واقف ہوں، میں نے نوعمری میں سب کام کیا ہے، حتیٰ کہ طالب علمی کے دوران بھی جب کبھی گھر پہنچتا تو دوسرے دن ہی کدال لے کر کھیت چلا جاتا تھا۔ میں خود کیاری بناتا، بیج ڈالتا اور خود ررو پودے اور گھاس صاف کرتا تھا'' اس طرح آپ نے اپنی محنت اور جہد مسلسل سے کامیابی کی نئی تاریخ رقم کی اور اپنے کمالات اور خوبیوں کی وجہ سے ہی اپنے رفقاء اور اساتذہ کی آنکھوں کا تارا بنے، اسی پس منظر میں آپ ہمیشہ اپنے ان بزرگوں اور اساتذہ کے منت کش

رہے جنھوں نے آپ کو کسی بھی طرح سنبھالا دیا، الداعی میں شائع ہونے والے مشہور کالم "إشراقة" میں علمی و ادبی موضوعات اور طویل تجربات کے علاوہ زندگی کی ناہمواریوں اور مختلف مراحل کی دشواریوں کی جھلک کسی بھی حساس قاری کو نظر آسکتی ہے، اور اس کے ذریعے آپ کی زندگی کے مختلف اوراق پڑھے جاسکتے ہیں، اشراقات کا یہ مجموعہ ''من وحی الخاطر'' کے نام سے پانچ جلدوں میں شائع ہوچکا ہے۔

۹- ترجمہ وخاکہ نگاری

زبان کی نزاکت و لطافت کے ساتھ آپ کو شروع ہی سے جستجو، تحقیق اور درست معلومات وحقائق تک رسائی کا خاص اہتمام رہا ہے؛ اس لیے آپ نے شخصیات کے احوال وکوائف کے تعلق سے جو کچھ تحریر کردیا ہے اس کو دستاویزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ آپ کی عادت عموماً کسی بڑی شخصیت کے انتقال پر الداعی میں تعزیتی وتاثراتی مضامین تحریر کرنے کی رہی ہے، جس میں شخصیت کی نمایاں خصوصیات مؤثر انداز میں پیش فرماتے۔ اس کے بعد بڑی جامعیت کے ساتھ سوانحی نقوش بھی درج کرتے، جس میں ماہ وسنین اور دوسری معلومات پیش کرنے میں صحت کا خاص خیال رکھتے۔ انھیں مضامین کو جب آپ نے اردو کا قالب دیا تو اردو میں بھی سوانح ووقائع نگاری کی ایک نئی روایت سامنے آئی، جس میں نام سے لے کر ٹائٹل، ترتیب اور مشمولات تک ہر اعتبار سے انفرادیت اور خوبی نمایاں تھی؛ چنانچہ ''وہ کوہ کن کی بات'' کے بعد ''پس مرگ زندہ'' کو اہل ذوق نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اب بہت جلد ان شاء اللہ ''رفتگان نارفتہ'' اہل بصیرت کی آنکھوں کا سرمہ ثابت ہوگی۔ اختصار اور جامعیت کے ساتھ آپ کے ترجمہ وخاکہ نگاری کی زبردست صلاحیت اور قابل تقلید اسلوب کا اظہار وہاں ہوتا ہے جہاں آپ نے کسی شخصیت پر کوئی حاشیہ اور تشریحی نوٹ لگایا ہے۔ اردو کتابوں کے علاوہ عربی میں ''العالم الہندی الفرید'' اس کی بہترین مثال ہے۔ مذکورہ بالا کتابوں میں ''پس مرگ زندہ'' کو خاص مقام حاصل ہے، فنی اعتبار سے ''خاکہ'' کی تعریف صادق آتی ہے۔ حضرت مولانا نے اس کتاب میں قارئین کی نفسیات، ضروریات اور جذبات کا لحاظ رکھا ہے اور اس پہلو سے وہ اپنے مقصد بلکہ اس صنف ادب میں نئی طرح ڈالنے اور خوش گوار اضافہ کرنے میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

۱۰- زہد وعبادت

صرف بھاری بھرکم الفاظ، پرشکوہ تعبیرات اور نادر استعارات وتشبیہات سے تقریر یا تحریر میں اثر

انگیزی اور طاقت وقوت پیدا نہیں ہوتی ہے، جب تک اس میں سوز دروں اور اخلاص وتقویٰ کی آنچ شامل نہ ہو۔ جذبہ طاعت وعبادت کے بغیر محض عبارت آرائی مس خام اور نقش ناتمام ہے، جس میں خون جگر سے رنگ بھرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت مولانا کو سوز دروں اور تعلق مع اللہ کی خاص دولت عطا ہوئی تھی۔ عبادت بڑے ذوق وشوق سے کرتے اور رب کے حضور گرم گرم آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کرتے تھے۔ آپ کے رفیقِ حج مشہور صحافی معصوم مرادآبادی عینی شہادت دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میں نے پایا کہ مولانا ایک انتہائی متواضع اور منکسر شخصیت کے مالک ہیں، عبادت وریاضت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی رات میں میری آنکھ کھلتی وہ مصلے پر ہوتے، کبھی نماز پڑھتے ہوئے اور کبھی اللہ کے حضور میں گڑگڑاتے ہوئے، اکثر پوری پوری رات یوں ہی بسر ہوتی، میں نے پہلی بار کسی بندہ خدا کو یوں اپنے رب کے حضور میں گڑگڑاتے ہوئے دیکھا تھا، ان کے اس عمل کا میرے دل پر خاص اثر ہوا، یہ پورے سفر میں ان کا معمول رہا۔''

مولانا کی ذاتی زندگی میں استغنائیت کا وصف بھی نمایاں تھا، عزتِ نفس پر حرف نہ آئے اس کا بڑا خیال تھا، عالمانہ وقار کو ٹھیس نہیں پہنچنے دیتے تھے اور اس سلسلے میں طلبہ کو بھی ہدایت دیتے رہتے تھے۔

اپنے ناقص تتبع کے اعتبار سے حضرت مولانا کی عبقریت کو سمجھنے کے لیے دس خصوصیات ذکر کردی ہیں اور انھیں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔ع

دامنِ نگاہ تنگ وگل حسن تو بسیار

اللہ ربّ العزت حضرت مولانا کی جملہ خدمات وحسنات کو قبول فرمائیں اور اعلیٰ علیین میں مقام بلند عطا فرمائیں۔ آمین!

❁ ❁ ❁

دردمند عالمِ دین، سحر طراز انشاء پرداز

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ

از: مولانا مفتی عمران اللہ قاسمی
استاذ شعبہ عربی ونگراں شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

عربی زبان سے عشق کی حد تک تعلق رکھنے والے، صاحبِ طرز ادیب، سیکڑوں عشاقِ لسانِ نبوت کے مربّی، سحر طراز صاحبِ قلم، اثر آفریں انشاء پرداز، اسالیب وتعبیرات کی جدت طرازی کے رسیا، فصیح وبلیغ عربی زبان بولنے اور لکھنے پر عربوں کی طرح قدرت یافتہ، عربی رسالہ ''الداعی'' کے ایڈیٹر، اہلِ زبان عرب کے مابین باوقار وممتاز، نمایاں عربی خدمات انجام دینے پر صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ یافتہ، نیز اردو زبان کے شیریں انداز، منفرد والبیلے اسلوب کے خالق، بلند پایہ مصنف، معروف تذکرہ نگار، دارالعلوم کے قدیم ومقبول استاذ؛ کہ طلبہ اور نوآمیز عربی دانوں کی عربی کے لیے ان کی تصویب اور اعتماد باعثِ فخر، متعدد اساتذہ فن کے استاذ، جن کے جادوئی قلم کی مضمون نگاری نے سیکڑوں اکابر علماء کی زندگیوں کو پسِ مرگ تابندہ بنادیا۔

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ، ولادت کے تین ماہ بعد ہی والد کے سایہ سے محروم ہوگئے تھے، شفقت پدری کے بغیر زندگی کا سفر شروع ہوا، مشقتوں اور دشواریوں کے ساتھ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۶؍شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۰؍دسمبر ۱۹۶۷ء کو دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور اُس وقت کے دارالعلوم میں اساطینِ علم وفن اساتذہ سے استفادہ کیا، خصوصی طور سے لاثانی استاذ، بے مثال مربی، مردِ رجال ساز حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے دامن سے وابستہ ہوگئے، پھر چند ناگزیز اسباب کی بناء پر دارالعلوم سے علاحدہ ہونا پڑا، تو دلی کے معروف ادارے مدرسہ امینیہ میں داخل ہوئے، یہاں حضرت شیخ الاسلام کے فیض یافتہ، معتمد وفدائی حضرت مولانا سید مشہود حسن امروہویؒ اور سلطان القلم، معروف مورخ وفقیہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ ودیگر اساتذہ مدرسہ امینیہ کی تربیت اور فیضِ صحبت سے مستفید ہوئے، اپنی محنت ویکسوئی کی بنا پر سید الملت حضرت مولانا سید محمد

میاں صاحب کی محبت وتوجہ آپ پر منعطف ہوگئی، حضرت سید الملت آپ کی ذات کی تعمیر اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے کوشاں رہتے، ایک درمند باپ کی طرح آپ کے آرام اور مستقبل کے لیے فکرمندی ان کی گفتگو اور طرزِ عمل سے ہویدا رہتی تھی، حضرت سید الملت اپنے متعدد خطوط میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے آپ کا ذکر خیر کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے مولانا علی میاں صاحبؒ غائبانہ طور پر ہی آپ سے متعارف اور آپ کی صلاحیتوں کے قائل ہوگئے تھے، پھر جب آپ سید الملت کے مشورے اور تجویز سے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے پاس پہنچے تو حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے آپ کی عربی انشاء پردازی، کام کی دھن اور یکسو مزاج ہونے کی وجہ سے آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ متعین فرمالیا، محنت کے ساتھ بحیثیت استاذ، تدریس کے فریضے کی ادائیگی کا سلسلہ شروع ہوا جو تقریباً دس سال تک جاری رہا، اس دس سالہ مدتِ تدریس میں متعینہ کتب پڑھانے کے ساتھ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے مشورے اور رہنمائی سے متعدد کتابوں کی تعریب اور ترجمہ کا کام بھی آپ نے انجام دیا، ندوۃ العلماء میں آپ کی تدریس اور عربی دانی پر بہت اعتماد کیا جاتا تھا، اُسی زمانہ میں بعض مدارس کی طرف سے زائد تنخواہ کے ساتھ تدریس قبول کرنے کی پیش کش ہوئی؛ مگر آپ نے ندوۃ العلماء کی ملازمت کو ہی ترجیح دی اور وہیں پر تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔

جب ۱۹۸۲ء میں نئی انتظامیہ کے تحت دارالعلوم دیوبند دوبارہ کھلا، انتظام و انصرام کو از سر نو استوار کرنے اور تعلیم وتعلّم، اصلاح وتربیت اور دارالعلوم کی سرگرمیوں کو بڑھانے کے مقصد سے متعدد باصلاحیت وتجربہ کار اساتذہ کو دیگر مدارس سے دارالعلوم دیوبند میں خدمت انجام دینے کے لیے مدعو کیا گیا، تو اُس وقت دارالعلوم کے عربی رسالہ ''الداعی'' کی ادارت اور عربی زبان وادب کی تدریس کے لیے اربابِ انتظام کی بابصیرت نظر نے آپ کا انتخاب کیا؛ چنانچہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ نے ۱۲ر رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ مطابق ۷ر جون ۱۹۸۲ء کو بطور حکم نامہ ایک خط آپ کے نام ارسال کیا، حضرت مولانا کیرانویؒ نے اُس خط میں تحریر کیا:

> ''میں ابھی دہلی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں اور وہاں سے موریشس جاوں گا، اس وقت بلاتمہید کہنا یہ ہے کہ دارالعلوم کو آپ جیسے ہونہار اور مخلص افراد کی ضرورت ہے ''الداعی'' اور تدریس کے لیے آپ کا انتخاب کیا گیا ہے، اگر آپ کے لیے کوئی خاص مانع نہ ہو تو کوشش کر کے دارالعلوم آجانے کا فیصلہ کرلیں اور ماہ شوال میں آجائیں تو بہتر ہے''۔ (وہ کوہ کن کی بات)

حضرت الاستاذ اور دیگر حضرات کے حکم کی تعمیل میں آپ دارالعلوم دیوبند حاضر ہوگئے، مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۴، ۲۵، ۲۶ر شوال ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۵، ۱۶، ۱۷ر اگست ۱۹۸۲ء میں آپ کا باضابطہ تقرر عمل میں

آ گیا، اب آپ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا، جس میں جدوجہد، یکسوئی، انہماک وشغف کے ساتھ متعینہ کتابوں کی تدریس، عربی زبان وادب کی تعلیم، طالبان علوم نبوت کو کسی لائق بنادینے، ان کو عربی زبان کا نہ صرف آشنا بلکہ قادر بنادینے کی کوشش، دارالعلوم کے پیغام کو عام کرنے، مختلف مجالس، سیمینار اور کانفرنسوں میں دارالعلوم کی ترجمانی، اکابرِ دیوبند کے علوم ومعارف کو عربی زبان میں منتقل کرنے، عربوں کو اُن سے استفادہ کے مواقع فراہم کرنے، مشہور اکابر وعلماء کے عربی اوراردو میں جامع اور موثر تذکرے تحریر کرکے ان کی زندگی کو تابندگی بخشنے، اردو اور عربی میں متعدد موثر مفید کتابیں تیار کرنے، رسالہ ''الداعی'' کو معیاری بنانے اور عالمی پہچان دلانے جیسے کارنامے آپ کی نمایاں خدمات ہیں۔

حضرت مولانا کیرانویؒ نے عربی زبان وادب کے احیاء کا جو مشن شروع کیا تھا آپ نے نہ صرف اُس کو جاری رکھا؛ بلکہ حسن، تہذیب وشائستگی کے ساتھ اس کو استحکام وارتقاء سے آراستہ کیا، آپ نے اپنی عملی زندگی کا پورا دورانیہ تدریس اور تصنیف میں مشغولیت کے ساتھ ہی بسر کیا، دن ورات اسی میں مصروف رہتے، اپنے تمام تر اوقات اور پوری توانائی اِسی میں صرف کرتے تھے، کسی دوسری طرف بالکل متوجہ نہ ہوتے، شاید اس میں استاذِ محترم حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ کی نصیحت پر عامل تھے؛ کیوں کہ جن دنوں آپ ندوۃ العلماء میں استاذ تھے سید الملت حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے ایک خط میں آپ کو نصیحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

> ''حضرت الاستاذ شیخ الادب (مولانا اعزاز علی صاحبؒ) نے احقر کو ہدایت فرمائی تھی کہ مدرس کا فرض درسی مشاغل میں انہماک ہے، اس کو ادارے کی سیاسیات میں دخل دینا چاہیے نہ اندرونی معاملات میں، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی کامیابی بھی یہی ہے، ان سے منقول ہے کہ ہمارے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت تھی لَاتُنَازِعِ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ امید ہے کہ آپ بھی یہی مسلک اختیار کریں گے۔ والسلام محتاج دعا: محمد میاں'' (پس مرگ زندہ، ص:۷۵)

مولانا نے اپنے استاذ محترم کی اس نصیحت پر گرہ باندھ لی، اس پر عمل کرتے ہوئے یکسو ہوکر زندگی گذاری، ہمہ وقت اپنے کام میں مصروف رہتے تھے، فضول ملاقات اور مجلسوں کے حاضر باشی سے گریزاں رہتے ہوئے عالمی جرائد ورسائل کی ورق گردانی، مطالعہ کتب ''الداعی'' کی ترتیب وتہذیب یا پھر کسی نئی کتاب کی تصنیف میں ہی نظر آتے، انھوں نے رسالہ ''الداعی'' کو بلند معیار تک پہنچانے میں انتھک محنت کی، اُس کی ترتیب میں معروف اہلِ قلم کے مضامین کو شاملِ اشاعت کرتے، حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ مقالات شائع کرتے، اُن کا تحریر کردہ ''كلمة المحرر''

اور ”كلمة العدد“ بہت پسند کیا جاتا تھا، رسالہ کے آخر میں ”اشراقہ“ نامی کالم زبان وبیان اور پیغام کے اعتبار سے اچھوتا اور مثالی ہوتا تھا، وفات سے تقریباً ایک سال قبل آپ نے قدیم رسائل سے ”اشراقہ“ کی تمام اقساط حاصل کر کے نظر ثانی کے بعد اُن کو ”من وحی الخاطر“ کے نام سے ترتیب دے دیا، جو طبع ہو چکی ہے، یہ اہلِ علم وفضل اور طلبہ کے لیے ایک خاصے کی چیز ہے۔

مدرسہ کے ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ عالمی حالات سے واقفیت رکھتے تھے، بی بی سی نیوز کا سننا، متعدد اخبارات کا مطالعہ کرنا ان کا معمول تھا جس کے ذریعہ وہ دنیا کی سیاسی صورتِ حال سے باخبر رہتے تھے، خبروں کا تجزیہ، حالات پر تبصرہ ان کی دلچسپی کے عناوین تھے، اس حوالے سے وہ اپنی مضبوط رائے بھی رکھتے تھے، عالم اسلام پر دشمن طاقتوں کی یلغار، سیاسی غلبہ، عربوں کی دولت پر قبضہ جمانے کے لیے رچی گئی ان کی سازشوں کا پورا ادراک مولانا کو حاصل تھا، وہ اپنے قلم کی جولانی سے مسلمانوں کو اُن حالات سے آگاہ کرتے رہتے، تقریباً چالیس سال سے زائد عرصے سے جب سے انھوں نے عربی لکھنا اور عالمِ عرب کے حالات پر نظر رکھنا شروع کیا تھا ان کو فلسطین کے مسئلہ سے دلچسپی رہی، وہ رسالہ الداعی میں اس پر مسلسل لکھتے رہتے تھے، قضیہ فلسطین سے متعلق رونما ہونے والے انقلابات، اتار چڑھاؤ، شدت، پیچیدگی، مسلم امت کی اس کے متعلق ہمدردی وتعاون، فلسطینیوں کی مزاحمت، ان کی تباہی، بربادی، شہادت، اسرائیل کی طرف سے اُن کی ناکہ بندی، اُن کی پناہ گزینی کی رحم انگیز زندگی، فلسطینیوں کی ثابت قدمی، عرب حکمرانوں کی بے حسی، سرزمین فلسطین کو ہڑپنے کے لیے صلیبی سازشیں اجاگر کرتے رہتے تھے؛ تاکہ اُمّتِ مسلمہ فلسطین کی بازیافت، مسجد اقصیٰ کی بحالی کے لیے کی جانے والی کوششوں سے باخبر رہے اور تاریخ ودینِ اسلام میں اس کی اصل اہمیت سے آنے والی نسلیں غافل نہ رہیں اور یہ حالات تاریخ میں محفوظ ہوجائیں، فلسطین سے متعلق مولانا کی تحریروں میں دردمندی، پرسوزی، اثر پذیری اور واقعات کی سچائی کے ساتھ بہت سی معلومات ہوتی تھیں، مولانا نے فلسطین سے متعلق تمام تحریرات کو نظر ثانی کر کے ایک کتابی شکل دے دی جو اردو اور عربی دونوں زبانوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئی، یہ کتاب اپنے عنوان پر ایک تاریخی دستاویز ہے جو بیش بہا معلومات پر مشتمل ہے۔

۱۱ر ستمبر کے واقعہ کے بعد عالم اسلام پر امریکہ اور یورپ کی طرف سے عسکری حملے اور فکری یورشیں بڑھ گئی تھیں، اس سے قبل عراق کی تباہی، عراقیوں کا قتل عام کیا گیا، لاکھوں عراقی لقمہ اجل بنادیئے گئے، لاکھوں کو بھوکے ننگے مرنے اور تڑپنے پر مجبور کیا گیا، اسرائیلی ایجنسی موساد کے ہاتھوں ہزاروں عراقی سائنسداں، انجینئرس، ڈاکٹرس، علماء واساتذہ میں سے چیدہ چیدہ افراد کو قتل کے گھاٹ اتارا گیا، لبنان میں خانہ جنگی کی آگ روشن کر کے عربوں کے مابین منافرت کو ہوا دی گئی، پھر ایک

بہانے سے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، افغانیوں کو بدتر حالت میں پہچانے کے لیے مسلسل سازشیں رچی گئیں ان سب کے باوجود امریکہ اوراس کے ہمنوا یہ کہتے نہیں تھکتے کہ یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف ہے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہیں، اخبارات، رسائل اور میڈیا پر اس جھوٹے دعوی کا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ یہ تہذیبی تصادم نہیں ہے، حضرت مولانا نے ان طاقتوں کے پروپیگنڈے کو بھانپ لیا اور قلم سے ان کے دعوی کا پردہ چاک کیا، مضبوط شواہد کی روشنی میں واضح کیا کہ ستمبر کا واقعہ کن طاقتوں کا برپا کردہ تھا؟ عراق میں قتل وخون کی ہولی، فرقہ واریت کا ننگا ناچ کس نے کھیلا؟ امریکہ اور یورپ کے لیڈران کے بیانات اوران کی عملی کارروائی کے تضادات سے مولانا نے ثابت کیا کہ یہ اسلام کے خلاف صلیبی وصیہونی جنگ ہے۔

اس وقت کے حالات میں اہل ایمان کی طرف سے کی جانے والی دعاوں کے اثرات بظاہر مرتب نہ ہونے اور اسلام مخالف، مسلم دشمن طاقتوں کے روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہونے کی وجہ سے بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں مایوسی اور زبان پر شکوہ ☐ پیدا ہوگئی تھی، ان کی زبانوں پر ایسے کلمات جاری ہونے لگے جو عقیدے کی پختگی میں کمی کو ظاہر کرتے تھے، حضرت مولانا نے اپنے قلم کے ذریعہ اس خلجان کو دور کرنے کی کوشش کی اور اپنی تحریرات میں مدلل طور پر بتایا کہ زمانہ حاضر کی موجودہ صورتِ حال، ماضی میں نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آچکی ہے، اور آپ کے کردار وعمل میں اس سے نمٹنے کا تجربہ موجود ہے، اسلامی تعلیمات، نبوی ہدایات، صحابہ وصالحین کے فکر وعمل میں ایسی تدبیریں پائی جاتی ہیں جن کے ذریعہ ان حالات سے ابھرنے اور ایمان وعقیدے کی پختگی کے ساتھ مستقبل میں اٹھنے والے کسی بھی فتنہ سے مقابلہ کی ہمت وجرات پیدا ہوگی۔

عالمی منظرنامے پر بدلتے حالات سے مولانا بہت فکرمند رہتے تھے، نجی مجلسوں میں بڑے سوز کے ساتھ ان کو بیان کرتے، گفتگو اور تحریر سے ان کا اضطراب ودل سوزی اجاگر ہوتی رہتی تھی، اِسی وجہ سے انھوں نے اپنی تحریرات کے ذریعہ مسلمانوں کی خوابیدہ فکر کو جگانے، علماء کی فکر ونظر کو مہمیز کرنے کا کام کیا، مولانا عربی زبان میں اپنی فکر اور دلی احساسات کو ظاہر کرتے اور عربوں کو مخاطب بنا کر اُن کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے تھے؛ کیوں کہ عربوں میں وہ صلاحیت ہے کہ آج بھی وہ پوری دنیا میں مسلم قیادت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں اور پوری امت ان کی قیادت کو تسلیم کرسکتی ہے۔

ابتدا سے ایک طویل مدت تک آپ صرف عربی زبان میں لکھتے رہے، تمام مضامین، کتابیں عربی زبان میں ہی تحریر کرتے رہے؛ مگر جب آپ کے مربی خاص استاذ محترم حضرت مولانا وحیدالزماں قاسمی کیرانوی کی وفات ہوئی اور آپ نے اُن کے حالات وواقعات، اچھوتے طریقۂ تعلیم، اندازِ تربیت اور

زندگی کے میدانوں میں ان کے کارناموں پر مشتمل، شگفتہ وشیریں اردوزبان میں کتاب تیار کی، ''وہ کوہ کَن کی بات'' نامی یہ کتاب اردو میں آپ کی پہلی کاوش تھی، جوزبان کی شگفتگی، انداز کی برجستگی وبیساختگی کے اعتبار سے ایک ادبی شاہکار اور شہ پارہ تسلیم کی گئی، اہلِ زبان وادب کے طبقہ میں اس کو توقع سے زیادہ پذیرائی ملی تو محبین کی طرف سے اردو میں لکھنے کا مطالبہ ہونے لگا، پھر آپ نے گاہے گاہے اردو میں بھی مضامین تحریر کیے، چند سال قبل آپ نے اردوداں طبقہ کو بھی عالمی حالات، صلیبی وصیہونی سازشوں سے باخبر کرنے کے مقصد سے اپنے قدیم وجدید عربی مضامین میں سے اکثر کو اردوزبان میں منتقل کرواکر شائع کرانا شروع کیا جنھیں علمی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا، بعد میں آپ نے وہ مضامین ترتیب دے کر کتابی صورتوں میں بھی شائع کردیئے؛ چنانچہ ''فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں''، ''اسلام کے خلاف صلیبی صیہونی جنگ''، ''کیا اسلام پسپا ہورہا ہے؟'' اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اسی طرح وفات پاجانے والی معروف شخصیات پر آپ نے جوعربی زبان میں خاکے اور مفصل مضامین تحریر کیے تھے ان کو بھی اردو جامہ پہنادیا ''پس مرگ زندہ'' کے نام سے منظرعام پر آنے والا مجموعہ اور ''رفتگانِ نارفتہ''، ''خاکی ،مگرافلاکی'' زیرطبع مجموعے مولانا کے شاہکار قلم کے اردو نتائج ہیں۔

حضرت مولانا ایسے صاحبِ قلم تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں ہزاروں صفحات لکھے، اُن کا لکھا ہوا ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے، زبان وبیان، اسلوب وتعبیر، فکرودرد ہراعتبار سے مولانا کی تحریریں ایسی ہیں کہ تحریروانشا پردازی کے طالب علم کو ان میں زبان کی چاشنی، تہذیب وشائستگی، اسلوب وتعبیر کی خوبصورتی، عمدہ الفاظ کا انتخاب ملے گا جن کو برتنے سے وہ ایک عمدہ اوراچھا قلم کار بن سکتا ہے، اسی طرح عالمی حالات پر مشتمل مولانا کی تحریروں میں واقع نگاری، سچائی، واقعات کا تجزیہ وتحلیل، دقیقہ رسی، فکرانگیزی اورایسی حقائق بیانی پائی جاتی ہے کہ پڑھنے والے میں قوم وملت کے مسائل سے ہمدردی جاگ اُٹھے گی، شخصیات پر لکھے گئے خاکوں اور تذکروں میں واقعات کی سچائی، صاحبِ تذکرہ کی نیکی وپرہیزگاری، پھر مولانا کا سحرانگیز اسلوب، قاری میں صلاح و پرہیز گاری کے اوصاف اُجاگر کرنے کا سبب بن سکتا ہے، کسی تحریر میں ایسی اثرپذیری اسی وقت ممکن ہے جب کہ لکھنے والے کے پہلو میں دل دردمند ہو اور وہ حساس طبیعت کا مالک ہو پھر وہ سچائی اوراخلاص کے ساتھ اپنے قلم کو جنبش دے۔

تقریباً ایک ماہ تک بیماری سے نبردآزما رہنے کے بعد حضرت مولانا دنیا سے رخصت ہوگئے، اب حضرت کے فیض یافتگان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مولانا کے چھوڑے ہوئے نقوش کو اپنا کر قوم وملت کی خدمت کا فریضہ انجام دیں۔

❁ ❁ ❁

دکھ تو ایسا ہے کہ دل آنکھ سے کٹ کٹ کے بہے!

از: مولانا نایاب حسن قاسمی

آہ! یہ انسانیت خور وبا ہمیں کیا کیا دن دکھائے گی اور کیسے کیسے لعل و گہر ہم سے چھینتی رہے گی۔ یوں تو ان دنوں کسی لڑی سے چھٹکے ہوئے موتیوں کی طرح ہر آن انسانی سانسیں ٹوٹتی بکھرتی اور اس عالمِ ہست و بود سے دور چھٹکتی جا رہی ہیں، مگر استاذ محترم مولانا نور عالم خلیل امینیؒ کی رحلت کا سانحہ نہایت ہی جگر خراش اور دل کو چھلنی کرنے والا ہے۔ کیسی زندہ دل شخصیت تھی اور کیسی رفعتوں کا حامل انسان۔ شایستگی ان کا خاصہ تھی اور شگفتگی ان کی فطرتِ ثانیہ۔ جیسی آبدار تحریریں لکھتے، ویسی ہی شاندار گفتگو کرتے، وہ حقیقی معنوں میں یکہ تاز ادیب تھے اور دل و دماغ میں سحر پھونکنے والے گفتگو طراز۔ مولانا سے جب بھی بات ہوتی ذہن شاداب ہو جاتا اور علم ونظر کے قیمتی موتی ہاتھ آتے۔ ابھی مولانا کئی اہم علمی وادبی منصوبوں پر کام کر رہے تھے، ان کا ایسے چلا جانا ان کے اہلِ خانہ و پسماندگان کے لیے ہی نہیں، دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان کے شاگردوں، ان کے مستفیدین و متعلقین اور پورے جہانِ علم و ادب کے لیے ایک جاں کاہ حادثہ ہے۔ دوسرے ہزاروں لوگوں کی طرح وہ میرے بھی استاذ تھے، ان سے کتابی علم حاصل کرنے کے علاوہ ان کی بافیض اور پر مغز باتوں سے بھی بہت کچھ سیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ابھی دکھ تو ایسا ہے کہ دل آنکھ سے کٹ کٹ کے بہے اور ذہن شدید اضطراب وانتشار سے دوچار ہے، مگر یادوں کو سمیٹنا بھی ضروری ہے، مولانا سے وابستہ وہ یادیں، جو بڑی پرلطف ہیں اور اب ان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا، سو کچھ غیر مرتب سطریں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مولانا کا نام بچپن سے ہی سنا ہوا اور جانا پہچانا تھا، کہ ابتدائی عربی سکھانے والی ان کی کتاب ''مفتاح العربیہ'' (دو جلدیں) پڑھ رکھی تھی اور ''خاصی محنت'' سے پڑھی تھی؛ البتہ ان سے پہلی ملاقات ۲۰۰۸ء میں ہوئی، تب میں دارالعلوم دیوبند میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ دارالعلوم بالاساتھ (سیتامڑھی) میں ہمارے استاذ گرامی مولانا قاضی محمد عمران قاسمی دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے، وہ مولانا کے

قدیم شناسا اور رشتے دار ہیں، انھوں نے کہا کہ چلو حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب سے ملوا کر تعارف کروا دیتا ہوں، آیندہ ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہنا اور استفادہ کرنا۔ عصر کے بعد ان کی معیت میں ملاقات اور تعارف کے بعد کچھ رسمی گفتگو ہوئی، دیو بند میں نو وارد تھا اور ابھی اساتذہ تو دور، اپنے ساتھی طلبہ سے بھی مانوس نہیں تھا، سو انھوں نے جو کچھ پوچھا، اس کا جواب دیا اور بقیہ وقت خاموش ہی رہا، بس قاضی صاحب گفتگو کرتے رہے۔ باضابطہ تعارف اور افادہ و استفادہ کا سلسلہ ۲۰۱۰ء میں شروع ہوا جب ہم تکمیلِ ادبِ عربی کی کلاس میں داخل ہوئے۔ درس گاہ میں کسبِ فیض کے ساتھ کبھی کبھی مولانا کے دولت کدے پر بھی جایا کرتے اور ان کی علمی و ادبی گفتگو سے مستفید ہوتے۔ میں خاص طور پر ان کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتا تھا، مختلف حالات و واقعات اور شخصیات پر ان کی رائیں اور تبصرے بڑے چست اور پر لطف ہوتے، معلومات میں اضافہ ہوتا سو الگ۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی بڑی اور اہم شخصیات کو دیکھا اور برتا تھا، سو ان کے تعلق سے ان کے خیالات میں قطعیت و ایقان ہوتا اور ان کی باتوں سے متعلقہ شخصیات کی زندگی و کردار کی کئی پرتیں کھل کر سامنے آجاتیں۔ درس گاہ میں بعض طلبہ کے منفرد قسم کے ناموں پر چٹکی لیتے اور وقتاً فوقتاً چھیڑ چھاڑ رہتی، خود سبق کے پہلے دن دیگر کئی رفقا کے ساتھ میں بھی ان کے رڈار پر آ گیا تھا، حاضری لیتے ہوئے مولانا نے میرا نام پکارا اور کہا ''نایاب حُسن''، سن کر ساری درس گاہ قہقہہ بار ہوگئی اور میں عجیب وغریب سہمی ہوئی شکل بنائے کھڑا رہا، پھر کہنے لگے تمھارا یہ نام کس نے رکھا ہے؟ حُسن بھی کہیں نایاب ہوتا ہے؟ انھیں پتا تھا کہ نام کا حصہ ''حُسن''، نہیں، ''حَسَن'' ہے، مگر ان کا طلبہ کو خود سے مانوس و بے تکلف بنانے کا اپنا اسٹائل تھا۔ کوئی طالب علم موٹا ہوتا، تو کہتے کہ یہ یہاں سے نکل کر مہتمم بنے گا اور ہم سب ان کی اس قسم کی برجستہ گوئیوں سے لطف اندوز ہوتے۔ جب سبق پڑھانا شروع کرتے تو ان کا انہماک دیدنی ہوتا، کتاب میں ڈوب جاتے، مزے لے لے کر پڑھاتے اور جھوم جھوم کر درس دیتے، مختصر اور طویل جملوں کے ترجمہ و تفہیم کے دوران ان کے دسیوں مواقعِ استعمال کی نشان دہی کرتے، عربی تراکیب و تعبیرات کے نئی پرانی شکلوں سے آگاہی بخشتے، عربی الفاظ، افعال و مشتقات کی اصل ہی نہیں، ان کی روح تک سے آشنا تھے اور دورانِ درس اپنی تمام تر ادبی، لسانی و تدریسی مہارت و معلومات طلبہ تک منتقل کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کے سبق سے اٹھنے کے بعد ہر دن یوں محسوس ہوتا کہ بہت کچھ نیا سیکھنے اور جاننے کو ملا۔ آج ان سے اکتسابِ فیض کرنے والے سیکڑوں زبان و ادب کے شناور ہیں، جو نامورانِ عصر میں شمار ہوتے اور اس یگانۂ عصر استاذ کی تعلیم و تربیت کے خوب

صورت نتائج کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

سال بھر ضابطے کی شاگردی کے بعد بھی طویل ومختصر زمانی وقفوں کے ساتھ مولانا کے خوانِ علم و ادب سے خوشہ چینی کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۰۱۸ء میں مولانا کے لیے عربی زبان وادب میں خدمات کے عوض صدارتی ایوارڈ کا اعلان کیا گیا، اس موقعے سے میں نے مولانا کو فون کرکے مبارکباد پیش کی، ایک مضمون بھی لکھا جس میں مولانا کی ادبی خدمات وامتیازات پر روشنی ڈالی۔ مولانا نے دعائیں دیں اور کہا کہ میرا اصل ایوارڈ تو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے میرے شاگرد اور کتابیں ہیں، جنھیں لوگ پڑھتے اور دعائیں دیتے ہیں۔ ۲۰۱۹ء میں دیوبند گیا تو وقت لے کر عصر کے بعد ملاقات کی، عصر اور مغرب کے درمیان کا وقفہ بہت کم تھا، سو کچھ خاص بات چیت نہیں ہو پائی، تو مغرب کے بعد مولانا نے فون کیا اور کافی دیر تک باتیں کرتے اور معذرت کا اظہار کرتے رہے، کہا کہ میں تم سے مزید گفتگو کرنا چاہتا تھا؛ مگر میری مصروفیات ایسی رہتی ہیں کہ بعض دفعہ بہت عزیزوں کو بھی وقت نہیں دے پاتا۔ دراصل مولانا پابندی اوقات اور ٹائم مینجمنٹ کے معاملے میں حد درجہ محتاط تھے، اس سلسلے میں وہ کوئی سمجھوتا نہیں کرسکتے تھے۔ انھوں نے اپنی نصف صدی کی عملی زندگی کے دوران زبان وادب اور علم وفکر کے شعبے میں جو قابلِ قدر خدمات انجام دیں، اس کی اہم وجہ یہی تھی کہ وہ وقت کے بے پناہ قدر شناس تھے، اسی وجہ سے وہ بہت ہی کم آمیز واقع ہوئے تھے، بلا وجہ رابطے بڑھانے اور تعلقات گانٹھنے سے انھیں سخت چڑ تھی، علما عام طور پر جلسوں اور مجمعوں کے شائق ہوتے ہیں؛ مگر مولانا دوسری ہی ڈھب کے انسان تھے، انھیں بھیڑ بھاڑ میں وحشت ہوتی تھی اور گوشہ نشینی میں عافیت محسوس کرتے تھے۔ پورے سال وہ شاید ہی ایک آدھ پروگرام میں کہیں جاتے، وہ بھی اگر ان کے ذوق ومزاج کا ہوتا تب، ورنہ بڑی سے بڑی شخصیت یا ادارے کی طرف سے آنے والی دعوت پر بھی خوش اسلوبی سے معذرت کرلیتے۔ انھیں موجودہ دور کے علما سے کئی شکایتیں تھیں، جن میں سے ایک ضیاعِ وقت سے متعلق بھی تھی اور بالکل درست تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کی زیادہ تر ناکامیوں کی وجہ تضییعِ اوقات اور زندگی کی ناقدری ہے؛ اس لیے وہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ ناپ تول کر خرچ کرتے اور اسے زیادہ سے زیادہ تصنیف وتالیف، مطالعہ وتفکر اور درس وتدریس میں صرف کرتے، کسی پر بے وجہ تھوڑا سا وقت خرچ کرنا بھی ان کی طبیعت کو نہایت گراں گزرتا تھا۔

میں نے اپنے مضامین کا پہلا مجموعہ ''عکس ونقش'' جب انھیں بھجوایا، تو دیکھنے کے بعد فون کرکے فرمایا کہ ماشاء اللہ! تمھاری تحریر میں بڑی پختگی آگئی ہے۔ مولانا کا معیارِ ردوقبول بڑے سخت اصولوں پر

مبنی تھا؛اس لیےان کے حوصلہ افزا کلمات سن کر دل بے پناہ مسرور ہوا۔ پھر اکثر ایسا ہوتا کہ میری کوئی تحریر مولانا کی نظروں سے گزرتی ،تو فون کرکے حوصلہ افزائی کرتے ،خوب دعائیں دیتے،ان کی وہ دعائیں میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔وہ معیاری علمی وادبی کام کرنے کے لیے ذہنی یکسوئی،وقت کی قدرشناسی،کثرتِ مطالعہ اوراپنے علم میں مسلسل اضافہ کرتے رہنے کواز حد ضروری سمجھتے تھے۔ذہنی یکسوئی کے لیے وہ ہرقسم کی فارغ البالی کواہم قرار دیتے تھے؛اس لیے ہمیشہ وہ دینی ودنیاوی سکون و سعادت کی دعائیں دیتےاورتوکل علی اللہ کےساتھ ان کی طلب وجستجو کے لیے بھی مہمیز کرتے رہتے۔

شوگر کا عارضہ مولانا کوعرصۂ دراز سے لاحق تھا اور کبھی کبھی اس کی شدت بہت زیادہ بڑھ جاتی تھی،اس کا اثر پاؤں پر زیادہ تھا؛اس لیے چلنے میں بھی قدرے پریشانی ہوتی،ادھر چند سالوں سے عصا لے کر چلنے لگے تھے،دوسری قسم کی علالتوں سے بھی دوچار رہتے ؛مگراس کے باوجود ان کے معمولاتِ تدریس وتحریراور دیگر ذمے داریوں کی بروقت اور کماحقہ ادائیگی میں کوئی کمی نہ آنے پاتی۔ دارالعلوم دیوبند سے وابستگی کےفوراً بعد درس وتدریس کے علاوہ انھیں وہاں سے شائع ہونے والے عربی رسالہ''الداعی'' کا مدیر بھی بنایا گیا،جو پہلے پندرہ روزہ تھا،پھر ماہنامہ ہوگیا۔ابتداءً مولانا اکیلےاس رسالے کی ادارت سے لے کر طباعت وترسیل تک کا کام کرتے اوراس مقصد سے ہر مہینے پندرہ دن کے وقفے سے دیوبند سے دہلی کا سفر کرتے ،بعد میں کچھ آسانیاں میسر آئیں،''الداعی'' کے لیے باضابطہ دفتر اورعملہ مختص کیا گیااوران کے ذمےصرف ادارتی امور رہ گئے؛مگر دونوں زمانوں میں انھوں نے رسالے کی اشاعت میں کبھی تاخیر کو گوارہ نہیں کیا،مدارس کے حلقے سے شائع ہونے والا غالبًا یہ واحد ایسا عربی رسالہ تھا،جو ہر ماہ بروقت شائع ہوتا تھا،کبھی کبھی دو ماہ کے شمارے ایک ساتھ تو شائع ہوئے؛مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس ماہ کا اگلے ماہ میں اوراگلے کا اس سے اگلے ماہ میں شائع ہوا ہو،جیسا کہ عام طور پر رسائل وجرائد کے ساتھ ایسا ہوتا ہے،اس پابندی کے ساتھ رسالے کے عالمی معیار کومینٹین کرنے کا بھی حد درجہ اہتمام کرتے۔یہی حال مولانا کی کلاس کا بھی تھا،بالکل وقت پر پہنچتے اوروقت پر ہی اپنا سبق ختم کرتے ،ایسے طلبہ کو کلاس میں گھسنے نہ دیتے جوان کی آمد کے بعد آتے،حالاں کہ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ ان کی کلاس میں طلبہ ان کی آمد کے بعد پہنچیں،زیادہ تر تو ایسا ہوتا کہ ان کی گل افشانیِ گفتار سے مستفیض ہونے کے لیے متعلقہ کلاس کے علاوہ دوسری کلاسوں کے ادب شناس طلبہ بھی ان کے پیریڈ میں آجاتے۔مولانا ایسے اساتذہ سے بھی سخت کبیدہ خاطر ہوتے جو اپنی درازنفس تقریر کے چکر میں ان کے گھنٹے کا کچھ حصہ'مار جاتے'۔

وہ اپنے عہد کے بےنظیر ادیب تھے اور ایک ادیب کی تمام تر لطافتیں، نفاستیں اور نزاکتیں ان کی ذات میں موجود تھیں، وہ صرف لفظوں کی فسوں کاری اور زبان و بیان کی حسن کاری پر ہی زور نہیں دیتے تھے؛ بلکہ ان کا زور اس پر بھی ہوتا تھا کہ انسان کو اخلاق ولباس اور بول چال کے معاملے میں بھی نفیس و نستعلیق ہونا چاہیے، خود ان کی تحریر وتقریر میں ہی نفاست ونزاہت نہ جھلکتی؛ بلکہ ان کا سراپا بھی ان کے انفراد وامتیاز کی گواہی دیتا، وہ جس مجلس میں ہوتے، اپنی وجیہ و باوقار شخصیت، علمی وادبی سربرآوردگی اور لباس و پوشاک کے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے سب میں نمایاں نظر آتے۔ بہترین کرتا پاجامہ، عمدہ شیروانی، سلیقے سے اوڑھی گئی کشتی نما (دیوبندی) ٹوپی، خوب صورت فریم اور موٹے شیشے کی عینک اور چمکتے ہوئے جوتے ان کی خوش قامتی کو مزید دیدہ زیب بنادیتے، چلنے کا انداز، دیکھنے کا ڈھنگ اور بات کرنے کا آہنگ؛ سب من کو موہ لینے والا ہوتا؛ چنانچہ وہ جدھر سے گزرتے، آس پاس کے لوگوں کی نگاہ بےساختہ ان پر جاٹھہرتی، پھر وہ اس وقت تک انھیں دیکھتے رہتے، جب تک مولانا نظروں سے اوجھل نہ ہوجاتے۔ اپنی اس غیرمعمولی نفاستِ ذوق کا وہ برملا اظہار واعلان بھی کرتے اور شاگردوں کو ایسے ہی اطوار اختیار کرنے کی تلقین بھی کرتے، کہ اس طرح زندگی کلفتوں میں بھی لذت بخش ہوجاتی ہے اور ویسے بھی خوش لباسی وخوش فکری ہر باشعور انسان کا زیور ہے۔ اگر کسی بڑے سے بڑے انسان میں بھی انھیں بدویت، بھونڈا پن یا بدمذاقی نظر آتی تو سخت تکلیف کا اظہار کرتے۔ وہ ان کتابوں کو بھی ہاتھ لگانا گوارہ نہ کرتے، جن کی جلد بندی بےڈھب، کاغذ ہیچ پوچ اور کتابت نگاہوں کو چبھتی ہو، کہا کرتے کہ مولانا! ایسی کتاب دیکھ کر قے ہونے لگتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ہر کتاب میں جتنی محنت مواد کو بہتر اور معیاری بنانے پر کرتے تھے، اسی قدر محنت اس کی معیاری طباعت پر بھی کرتے تھے۔

مولانا کی نفاستِ ذوق کے حوالے سے ایک اور واقعہ پردہ ذہن پر ابھر رہا ہے، ایک دن سرِ شام فون آیا، دعا سلام کے بعد کہنے لگے بیٹا! ایک بات معلوم کرنی ہے۔ اردو والے جو انگریزی کے ''انٹرنیشنل'' اور عربی کے ''دولی یا عالمی'' کے اردو متبادل کے طور پر ''بین الاقوامی'' لفظ استعمال کرتے ہیں، اس کو کیسے لکھتے ہیں؟ میں تو عام طور پر الف لام کے ساتھ ہی لکھتا ہوں، مگر تم چوں کہ اردو زبان و ادب کی ''مارکیٹ'' میں ہو؛ اس لیے سوچا پوچھ لوں۔ پہلے تو مولانا کے مخصوص طرزِ ادا اور اندازِ بیان سے لطف اندوز ہوتا رہا، پھر اپنے علم کے مطابق کہا کہ عام طور پر اردو والے ''بین الاقوامی'' ہی لکھتے ہیں، البتہ میں نے مولانا عبدالماجد دریابادی اور ایک آدھ مزید بڑے ادیبوں کی تحریروں میں ''بین

اقوامی'' لکھا ہوا دیکھا ہے؛ بلکہ مولانا دریابادی اردو میں مستعمل اس قسم کی جملہ ترکیبوں کو بغیر الف لام کے ہی لکھتے تھے، جیسے: ''بین ملّی''، ''بین معاشرتی'' وغیرہ۔ کہنے لگے کہ مولانا کی تحریریں تو میں بھی پڑھتا رہا ہوں؛ لیکن کبھی اس پر توجہ نہیں دی، گویا اس لفظ کو اردو مزاج میں ڈھالنے کے لیے یوں بھی لکھا جاسکتا ہے۔ پھر برسبیل تذکرہ میں نے ''بین الاقوامی'' کے تلفظ کے تعلق سے کہا کہ اردو حلقوں میں جن لوگوں کا عربی پس منظر نہیں ہوتا اور وہ نہیں جانتے کہ بین کی نحوی واعرابی حیثیت کیا ہے، وہ اس لفظ کو ''بینُ الاقوامی'' بولتے ہیں، یہ سنتے ہی مولانا نے سخت ناگواری کا اظہار کیا اور کہا توبہ، توبہ! یہ تو سخت بدذوقی؛ بلکہ بیہودگی کی بات ہے۔

مولانا کی شایستگیِ ذوق کا معاملہ نشست وبرخاست سے لے کر لباس وپوشاک، اندازِ گفتگو اور تحریر وتصنیف تک یکساں تھا۔ چائے پیتے ہوئے تیز تیز چسکی لینے کو بھی وہ معیوب سمجھتے تھے، وہ بیٹھنے کا سلیقہ بھی سکھاتے تھے اور چلنے کا طریقہ بھی۔ ان کا جمالیاتی ذوق نہایت ہی اعلیٰ وبالا تھا سو وہ ہر عمل میں ترتیب وتنظیم اور جمال آرائی کو ضروری سمجھتے تھے اور بدنظمی، بے ترتیبی وبدمذاقی سے بے حد ناراض ہوتے، پھر اپنے فصیح وبلیغ انداز میں ایسی ڈانٹ پلاتے کہ سامنے والا تھرتھر کانپنے لگتا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے محبوب استاذ، بافیض مربی مولانا وحیدالزماں کیرانوی سے خاصے متاثر تھے اور اس حوالے سے اکثر ان کے واقعات سنایا کرتے۔

پچھلے لگ بھگ دوسال سے میں مولانا کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ اپنی خودنوشت لکھنے کا سلسلہ شروع کریں، جب بھی بات ہوتی تو اس کا تذکرہ ضرور کرتا؛ بلکہ ایک بار تو یہاں تک کہہ دیا کہ زندگی میں ہی اپنی سوانح لکھ دیں یہ بہتر ہے، ورنہ بعد از مرگ لوگ پتا نہیں کیا کیا جھوٹ سچ لکھ دیتے ہیں، انھیں خود اس کا بخوبی اندازہ تھا؛ بلکہ اکثر اس تعلق سے بڑی مزے دار باتیں بتایا کرتے، سو کہنے لگے کہ تمھاری بات بالکل صحیح ہے۔ خود مولانا کسی بھی شخصیت کی توصیف یا تذکرے میں غلو اور افراط وتفریط کو سخت ناپسند کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر صاحبِ علم وفضل انسان کی قدر کرتے اور اس کے تعلق سے وقیع رائے کا اظہار کرتے؛ مگر لفظوں کے انتخاب میں نہایت محتاط رہتے، حتی الامکان کوئی لفظ یا لقب ایسا استعمال نہ کرتے جو متعلقہ شخصیت کے قد سے بالا یا فروتر ہو اور اپنے لیے بھی غلو آمیز مدح وستایش کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسی طرح اپنی تحریروں میں درج کی جانے والی معلومات کی صحت کا بھی مولانا حد درجہ اہتمام کرتے تھے، واقعات وحالات کی درست تاریخ، صحیح پس منظر اور حقیقی جزئیات تحریر فرماتے اور دوسروں سے بھی وہ یہی توقع رکھتے تھے۔ جب ۲۰۱۸ء میں مولانا کو صدارتی ایوارڈ کے

لیے نامزد کیا گیا، تو اس مناسبت سے ان کے بہت سے قدیم وجدید شاگردوں نے بہت کچھ لکھا، میں نے بھی ہندوستان میں عربی زبان وادب کی خدمت اور فروغ میں مولانا کے کردار کو اُجالنے کی کوشش کی۔ بعد میں مجھ سے گفتگو کے دوران مولانا نے فرمایا کہ اور لوگوں نے پتا نہیں کیا کیا لکھ دیا ہے؛ مگر تمھاری تحریر بالکل متوازن اور معتدل ہے، تم نے وہی لکھا ہے، جو حقیقت ہے۔

خیر! خودنوشت لکھنے کے لیے میں مولانا کو اپنی ہر گفتگو میں آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور وہ اپنی مصروفیات اور بیماریوں کی وجہ سے معذوری ہی ظاہر کرتے رہے۔ ایک دن میں نے کہا کہ اگر خود لکھنا مشکل ہے تو کسی باصلاحیت شاگرد کو کہہ دیں، وہ روزانہ صبح یا شام ایک مقررہ وقت میں آپ کی خدمت میں آجایا کرے اور آپ اسے اپنا احوالِ زندگی املا کروادیا کریں، اس سلسلے میں، مَیں نے مولانا آزاد اور ان کی کتاب تذکرہ یاد دلائی اور بھی کئی بڑے لوگوں کے بارے میں بتایا کہ وہ تو اپنی پوری کتاب املا کروادیتے ہیں، کہنے لگے ان سب کے بارے میں جانتا ہوں، تمھارا کہنا درست ہے، مگر کبھی اس طرح لکھنے کی نوبت نہیں آئی؛ اس لیے میری طبیعت اس پر آمادہ ہی نہیں ہوتی۔ پھر پتا نہیں کیسے موڈ بنا تو ایک دن مغرب بعد فون کیا، کہا کہ میں نے تمھاری بات پر غور کیا ہے، سوچ رہا ہوں کہ مرتب انداز میں نہ سہی، غیر مرتب طریقے سے ہی احوالِ حیات لکھنے کا سلسلہ شروع کردوں، کہ زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں، معلوم نہیں کب سانس کی ڈور ٹوٹ جائے۔ (پچھلے کچھ عرصے سے مولانا کی ہر گفتگو میں کسی نہ کسی حوالے سے زندگی کی ناپائیداری، موت اور اختتامِ حیات کا ذکر آہی جاتا تھا) پھر فرمایا کہ اردو کی کچھ اچھی خودنوشتوں کے نام بتاؤ جو تمھارے پاس ہوں۔ میں نے بتایا تو آل احمد سرور، کنور مہندر سنگھ بیدی، ادا جعفری اور عابد سہیل کی خودنوشتیں بھیجنے کو کہا، میں نے دو چار دن میں بھجوادیں۔ لگ بھگ ایک ماہ بعد فون آیا، کہنے لگے آل احمد سرور کی خودنوشت (خواب باقی ہیں) پڑھ لی ہے، کتاب اچھی ہے؛ مگر طباعت و کتابت بہت خراب ہے، طبیعت پر جبر کرکے کتاب ختم کی ہے۔ عابد سہیل (جو یاد رہا) کے اسلوبِ تحریر کی تعریف کی اور کتاب کی طباعت کو بھی سراہا، ادا جعفری کی خودنوشت (جو رہی سو بے خبری رہی) کے بارے میں کہا کہ یہ کتاب میں نے پہلے بھی پڑھ رکھی تھی، ٹھیک ٹھاک ہے۔ بیدی کی کتاب (یادوں کا جشن) ابھی زیرِ مطالعہ تھی، پوری پڑھی نہیں تھی؛ مگر وہ بھی انھیں اچھی لگی تھی، بیدی کے شیریں اور بے تکلّفانہ طرزِ تحریر سے متاثر تھے، کتاب کے مشمولات بھی انھیں خاصے دلچسپ محسوس ہوئے۔ الغرض اب باضابطہ مولانا اپنی خودنوشت لکھنے کا ذہن بنارہے تھے؛ مگر 'اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'!

دراصل حالیہ سالوں میں، مولانا درس وتدریس، ''الداعی'' کی ادارتی ذمے داریوں کی ادائیگی اور دیگر تحریری سرگرمیوں کی انجام دہی کے ساتھ اس مجلّے میں تقریباً چار دہائیوں سے مسلسل ''اشراقۃ'' کالم کے تحت شائع ہونے والے اپنے علمی، فکری، ادبی و اصلاحی مضامین کی ترتیب و تالیف میں مشغول تھے؛ اس لیے بھی انھیں وقت نہیں مل پا رہا تھا۔ مولانا نے نہایت اہتمام سے ان مضامین کو اکٹھا کیا، انھیں بڑی محنت، دقت نظری اور جزرسی کے ساتھ پڑھا اور پانچ جلدوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا، کتاب کا نام مولانا نے ''من وحی الخاطر'' تجویز کیا، مجھ سے ذکر کیا تو بڑی خوشی ہوئی اور میں نے ''اشراقۃ'' کی علمی، ادبی وفکری خصوصیات پر ایک تعارفی مضمون بھی لکھا۔ اس کتاب کے منتخب حصوں کا اردو ترجمہ بھی مولانا شائع کرنا چاہتے تھے، اپنی تحریروں کا ترجمہ عموماً مولانا خود کرتے تھے، مگر شاید انھیں احساس ہونے لگا تھا کہ اب ان کا عرصہ حیات مختصر ہے، سو وہ اپنے کاموں کو جلد از جلد سمیٹنا اور پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتے تھے؛ چنانچہ ترجمے کے لیے ان کی نگاہِ انتخاب اردو کے ممتاز ادیب و ناقد اور مولانا کے عزیز ترین اور چہیتے شاگردوں میں سرِ فہرست حقانی القاسمی صاحب پر پڑی، مجھ سے کہا کہ ان کو آمادہ کرو، مولانا حقانی صاحب کے طرزِ تحریر اور ان کی ادبی و لسانی ہنرمندیوں کے بڑے معترف تھے۔ میں نے حقانی صاحب سے بات کی تو انھوں نے اپنی مصروفیات کی بنا پر مجبوری ظاہر کی، مولانا نے کہا کہ دو چار مضامین کا ہی سہی؛ لیکن حقانی صاحب ضرور ترجمہ کریں، باقی تم کردینا اور حقانی اس پر نظرِ ثانی کرلیں گے۔ حقانی صاحب اس کے لیے آمادہ ہوگئے، میں نے بھی مولانا سے وعدہ کرلیا اور کہا کہ کتاب آجائے تو آپ متعلقہ مضامین نشان زد کرکے بھجوادیں۔ مولانا کی شدید خواہش تھی کہ یہ کتاب ان کے معیار اور پسند کے مطابق جلد از جلد شائع ہوجائے؛ مگر طباعت کی تکمیل میں کورونا اور پچھلے سال بھر سے چلنے والے لاک ڈاؤن کی وجہ سے تاخیر در تاخیر ہوتی رہی، خدا خدا کرکے مارچ کے اوائل میں کتاب چھپ کر آئی؛ مگر وہ ان کے ذوق اور معیار کے مطابق نہیں تھی، کچھ خامیاں رہ گئی تھیں، جنھیں دور کروایا گیا اور رمضان سے دو تین دن قبل دوبارہ شائع ہوکر آسکی۔ ایک اور کتاب شخصیات وسوانح کے تعلق سے ''رفتگانِ نارفتہ'' کے نام سے ابھی زیرِ طبع ہے، اس میں چوبیس بڑے لوگوں کا دلنشیں تذکرہ ہے، مولانا اسے مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے۔ شخصیات ہی پر ایک کتاب کا مسودہ تقریباً تکمیل کے مرحلے میں تھا، نام اس کا مولانا نے ''خاکی، مگر افلاکی'' تجویز کیا تھا، یہ کتاب بھی ان کی حیات میں محروم طباعت رہی۔

مولانا کو میں فون کم کرتا تھا؛ کیوں کہ مجھے ان کی مصروفیت کا خیال رہتا۔ عموماً مہینے پندرہ دن

میں مولانا ہی یاد فرماتے اور احوال دریافت کرنے، دعاؤں سے نوازنے کے ساتھ مختلف علمی و ادبی موضوعات پر باتیں ہوتیں۔ مولانا سے گفتگو کے دوران میں بولتا بہت کم تھا، صرف مولانا کے سوالوں کے جواب دیتا اور زیادہ تر انھیں سنتا اور سر دھنتا؛ بلکہ اگر آس پاس میرا کوئی دوست موجود ہوتا تو سپیکر آن کر کے اسے بھی مولانا کی چٹخارے دار گفتگو اور شوخیِ بیان سے محظوظ ہونے کا موقع فراہم کرتا۔

ابھی رمضان سے دو دن قبل ۱۱/اپریل کو آخری مرتبہ گفتگو ہوئی۔ باتوں باتوں میں فرمایا کہ اب کوئی ایسا شخص ملتا ہی نہیں جس سے کچھ بے تکلّفانہ گفتگو کی جائے۔ ایک عمید الزماں کیرانوی (مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے برادرِ خورد، عربی کے بہترین ادیب ومترجم) تھے، انھیں جب چاہتا تھا، فون کر کے بات کر لیتا تھا، بھائی بدر الزماں (کیرانوی، مولانا وحید الزماں کیرانوی کے صا□ادہ، عربی وانگریزی کے عمدہ مترجم) سے وقتاً فوقتاً بات ہو جاتی تھی؛ مگر اب وہ خود بھی بیمار ہیں۔ شاگردوں میں تم کو وقت ناوقت پریشان کرتا رہتا ہوں، یہ سن کر میں نے کہا کہ حضرت! یہ تو میرے لیے بے انتہا سعادت کی بات ہے کہ آپ مجھے یاد رکھتے اور فراغت کے وقت میں گفتگو کے قابل سمجھتے ہیں، تو ہنسنے لگے اور پھر دعاؤں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہی آخری گفتگو تھی، اس کے دو چار دن بعد ہی مولانا کے چھوٹے صا□ادے بھائی ثمامہ نور سے بات ہوئی کہ طبیعت زیادہ خراب ہے، تو میں نے ان کی اجازت سے سوشل میڈیا پر اپنے احباب اور مولانا کے تلامذہ ومتعلقین اور مستفیدین سے دعاے صحت کی اپیل کی، پھر کبھی طبیعت بہتر ہونے اور کبھی بگڑنے کی خبریں ملتی رہیں، ڈاکٹر کی نگرانی میں دیوبند میں گھر پر ہی علاج چلتا رہا اور مولانا کے تمام اہلِ خانہ بھرپور خیال رکھتے رہے۔ ۱۹/اپریل کو میں نے ''رفتگانِ نارفتہ'' پر ایک تعارفی تحریر لکھی، جسے بھائی ثمامہ نے پڑھ کر مولانا کو سنایا، انھوں نے بتایا کہ مولانا اسے سن کر حسبِ معمول بہت خوش ہوئے اور خوب دعائیں دیں۔

دن بہ دن حالات ناگفتہ بہ ہوتے گئے تو اسپتال میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ۲۸/اپریل کو میرٹھ لے جایا گیا، وہاں سے بھی کبھی یاس انگیز تو کبھی امید افزا خبریں آتی رہیں، ۲/مئی کو معلوم ہوا کہ طبیعت کافی بہتر ہے، ۳/مئی کو دن میں بھی خوش کن خبریں ملیں، مولانا کے مکمل طور پر روبصحت ہونے کی امید پختہ ہونے لگی تھی؛ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا، سو بلاوا آیا اور مولانا پوری آمادگی، انشراحِ صدر کے ساتھ تسبیح وتہلیل پڑھتے ہوئے ایک بجے شب اپنے خالق کے حضور پہنچ گئے۔

آخرِ حیات میں ایک دن ثمامہ نور کو رآز الہ آبادی کا ایک شعر سنایا اور فرمایا کہ انٹرنیٹ سے پوری غزل نکال کر سناؤ، بھائی ثمامہ نے وہ غزل سنائی تو اشعار کی مخصوص لفظیات وآہنگ کی وجہ سے خود ان پر

بھی رقت طاری ہوگئی اور مولانا کی کیفیت بھی بدلنے لگی۔ وہ ان اشعار کو بار بار اس طرح پڑھتے کہ گویا شاعر نے انہی کا احوالِ دل بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی اشعار کی فنی خوبیوں اور شاعر کے کمالِ ہنر پر بھی اپنی بھرّ ائی ہوئی آواز میں اظہارِ خیال کرتے جاتے۔ دراصل عربی واردو ہر دو زبانوں میں مولانا کا ادبی ذوق اعلیٰ تر اور نہایت شستہ وشگفتہ تھا، برمحل جملوں اور شعروں کا استعمال اپنے کلام اور تحریروں میں بے ساختہ کیا کرتے۔ رازؔ الہ آبادی کے ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاتے جاتے بھی مولانا کیسے حاضر دماغ تھے اور کیسے صوفیانہ رنگ کے اشعار ان کے ذہن وزبان پر وارد ہوئے:

آشیاں جل گیا، گلستاں لٹ گیا، ہم قفس سے نکل کر کدھر جائیں گے
اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے، اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے
اور کچھ دن یہ دستورِ مے خانہ ہے، تشنہ کامی کے یہ دن گزر جائیں گے
میرے ساقی کو نظریں اٹھانے تو دو، جتنے خالی ہیں سب جام بھر جائیں گے
اے نسیم سحر تجھ کو ان کی قسم، ان سے جا کر نہ کہنا مرا حال غم
اپنے مٹنے کا غم تو نہیں ہے مگر، ڈر یہ ہے ان کے گیسو بکھر جائیں گے
اشکِ غم لے کے آخر کدھر جائیں ہم، آنسوؤں کی یہاں کوئی قیمت نہیں
آپ ہی اپنا دامن بڑھا دیجیے، ورنہ موتی زمیں پر بکھر جائیں گے
کالے کالے وہ گیسو شکن در شکن، وہ تبسم کا عالم چمن در چمن
کھینچ لی ان کی تصویر دل نے مرے، اب وہ دامن بچا کر کدھر جائیں گے

جارج برنارڈ شا کا قول کہیں پڑھا تھا کہ آپ بسا اوقات کسی ایسے انسان کو کھو دیتے ہیں کہ لگتا ہے ساری دنیا انسانوں سے خالی ہوگئی۔ بلا شبہ مولانا کی رحلت کا سانحہ ایسا ہی ہے کہ وہ اپنی نوعیت کے فردِ فرید تھے، یکتائے زمانہ، فقید المثیل، عدیم النظیر، جس نے اپنے نام کی مناسبت سے ایک دنیا کو زبان وادب اور علم وفکر کی روشنی بخشی، جس کے ادب وفن کی جوئے سلسبیل سے ایک عالم سیراب ہوتا رہا، ہزاروں طالبانِ زبان وادب نے جس کے چشمۂ شفاف سے اپنی تشنگی دور کی اور جس کی خیال انگیز تصانیف نے عالمِ عربی وعجمی کو اپنا اسیر وگرویدہ بنائے رکھا:

دل دھڑکنے کا تصور بھی خیالی ہوگیا
اک ترے جانے سے سارا شہر خالی ہوگیا

(راحت اندوری)

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینیؒ

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو

از: مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی
نائب ناظم امارت شرعیہ بہار واڈیشہ وجھارکھنڈ

دارالعلوم دیوبند کے مؤقر استاد، اس کے عربی ترجمان الداعی کے باوقار مدیر، دسیوں کتابوں کے مصنف، مؤلف، مرتب، اور مترجم، قصر علم وادب کے آفتاب و ماہتاب، خوش مزاج، خوش وضع، خوش کردار، عالم اسلام کی زبوں حالی پر اشک بار، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی ابو اسامہ نور (ولادت ۱۸؍دسمبر ۱۹۵۲ء مطابق یکم ربیع الآخر ۱۳۷۲ھ) بن حافظ خلیل احمد (مارچ ۱۹۵۳ء) بن رشید احمد بن محمد فاضل بن کرامت علی صدیقی کا ۲۰؍رمضان ۱۴۴۲ھ مطابق ۳؍مئی ۲۰۲۱ء ایک بجے رات میرٹھ کے آنند اسپتال میں انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون، جنازہ دیوبند لایا گیا، احاطہ مولسری میں بعد نماز ظہر مولانا ارشد مدنی دامت برکاتہم نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مزار قاسمی میں جہاں اولیاء کرام، صلحاء عظام اور اساتذہ دارالعلوم کی ایک بڑی تعداد مدفون ہے، جگہ پائی، رمضان کا مہینہ، وبائی مرض میں موت کو مغفرت اور بخشش کے پروانے کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے پس ماندگان میں تین لڑکے، چار لڑکیاں اور ایک اہلیہ کو چھوڑا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی کا آبائی وطن رائے پور موجودہ ضلع سیتامڑھی ہے؛ لیکن آپ کی ولادت آپ کے نانا بابو جان بن محمد نھو بن محمد یار علی صدیقی کے گھر ہرپور بیشی ضلع مظفر پور میں ہوئی، یہ جگہ اورا کے قریب ہے، شمالی بہار میں ماضی قریب تک یہ روایت رہی ہے کہ خاص کر پہلے بچے کی ولادت کے موقع پر لڑکی کو میکے بلا لیا جاتا تھا؛ چنانچہ مولانا کی والدہ سلیمہ خاتون کو بھی میکے بلا لیا گیا تھا، ولادت کے صرف تین ماہ کے بعد مارچ ۱۹۵۳ء میں والد اللہ کو پیارے ہوگئے، دادا پردادا کی زندگی ہی میں گذر گئے تھے؛ اس لیے والد محجوب تھے جس کی وجہ سے زمین جائداد بھی نہیں ملی، یتیمی

اور بے سروسامانی میں دادی مقیمہ خاتون نے مدت رضاعت کے بعد پرورش کی ذمہ داری سنبھالی، والدہ صرف انیس سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں، اس لیے ان کی دوسری شادی مولانا کے چچیرے ماموں محی الدین بن محمد نقو سے ہوگئی؛ لیکن وہ بھی ۱۹۶۷ء میں داغ مفارقت دے گئے اور چونتیس سال کی عمر میں مولانا کی والدہ کو دوبارہ بیوگی کے صدمہ نے نڈھال کردیا، اسی غمناک ماحول میں مولانا کی پرورش وپرداخت ہوتی رہی۔

رسم بسم اللہ مولانا کے نانا بابو جان نے ادا کی، پھر مولوی ابراہیم عرف مولوی ٹھگن کے سامنے رائے پور میں زانوئے تلمذ تہہ کیا، رائے پور کے بعد مدرسہ نورالہدی پوکھر یرا موجودہ ضلع سیتامڑھی میں داخل ہوئے، وہاں سے ۱۳۸۰ھ مطابق جون ۱۹۶۰ء میں مدرسہ امدادیہ دربھنگہ چلے آئے، درجہ حفظ میں داخلہ لیا؛ لیکن سات پارے حفظ کرنے کے بعد درجہ ششم اردو میں منتقل ہوگئے، یہ ۱۹۶۱ء کا سال تھا، کم وبیش تین سال یہاں قیام پذیر رہے اور مولانا محمد اویس صاحب رائے پوری اور مولانا محمد تسلیم صاحب سیدھولوی کی تربیت میں رہے، یہیں حضرت مولانا ہارون الرشید جمال پوریؒ (سابق پرنسپل مدرسہ رحمانیہ سوپول، دربھنگہ) سے معلّم القرآن وغیرہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد دارالعلوم مئو کا رخ کیا، ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۴ء میں یہاں عربی اول میں داخلہ ہوا، مولانا ریاست علی بحری آبادی، مولانا امین صاحب ادروی عرف دادا، مولانا شیخ محمد مئوی، مولانا نذیر احمد مئوی (م ۲۰۲۰ء) مولانا نیاز احمد جہان آبادی، مولانا سلطان احمد مئوی، مولانا ریاض الحق مئوی، مولانا عبدالحق اعظمی، قاری محمد یٰسین اور مولانا محمد اسلام الدین مئوی سے کسب فیض کیا، ۱۶رشوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۰ردسمبر ۱۹۶۷ء کو آپ کا داخلہ دارالعلوم دیوبند میں ہوگیا، یہاں خاص طور سے عربی زبان وادب کی تعلیم مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانویؒ سے پائی اور مہارت تامہ پیدا کی، یہاں کے دیگر اساتذہ میں حضرت مولانا معراج الحق، مولانا محمد حسین بہاری، مولانا نصیر احمد خاں، مولانا فخرالحسن مرادآبادی، مولانا شریف الحسن، مولانا قمرالدین، مولانا خورشید احمد، مولانا حامد میاں اور مولانا بہار الحسن صاحبان کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ابھی فراغت نہیں ہوئی تھی کہ دارالعلوم کے طلبہ نے بعض معاملات کو لے کر اسٹرائک کردیا، کئی نامور طلبہ کے ساتھ مولانا کا نام بھی اس سے جڑ گیا، اور اس پاداش میں جن طلبہ کا اخراج ہوا، ان میں ایک نام مولانا مرحوم کا بھی تھا، یہ بڑا جاں گسل موقع تھا، ایسے میں حضرت مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند نے دست گیری فرمائی اور مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کے پاس لے گئے اور

انھوں نے اس ہونہار طالب علم کو ضائع ہونے سے بچالیا پھر مولانا مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل ہوئے اور یہیں سے سند فراغت حاصل فرمائی، اس پریشان کن وقت میں مدرسہ امینیہ نے دست تعاون دراز کیا اور سنبھالا تھا؛ اس لیے مولانا نے اعتراف کے طور پر اپنے نسبی باپ کے نام کے ساتھ اس روحانی باپ کے نام کو بھی اپنے نام کا جز بنالیا اور''امینی'' لکھنے لگے۔

تدریسی زندگی کا آغاز دارالعلوم ندوۃ العلماء سے کیا،۱۹۷۲ء سے بقول مولا عبدالمتین منیری بھٹکلی ۱۹۷۷ء تک یہاں تدریس کے فرائض انجام دیے، یہاں کا ماحول مولانا کی عربی زبان دانی اور حاصل شدہ مہارت کو صیقل کرنے کے لیے انتہائی خوش گوار تھا، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اور مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ کی نگارشات کا مولانا نے مطالعہ ڈوب کر کیا، وہاں سے نکلنے والے عربی اخبارات ورسائل اور خود حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی کی ادارت میں نکلنے والے جمعیت علماء کے ترجمان''الکفاح'' سے عربی صحافت کے اسرار و رموز سیکھے اور واقفیت بہم پہنچائی، انھوں نے عربی کے قدیم وجدید ادباء کی کتابیں کھنگال ڈالیں، جاحظ کے اسلوب وتعبیرات سے وہ بہت متأثر ہوئے؛ چنانچہ ان کی عربی تحریروں میں یہ رنگ غالب آ گیا۔ بقول مولانا منیری ندوۃ العلماء کے بعد مولانا مدرسہ کاشف العلوم اورنگ آباد چلے گئے اور ۱۹۸۲ء تک وہیں خدمت انجام دیتے رہے۔

۱۹۸۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں انقلاب آیا، اہتمام وانتظام بدلا، الداعی کے ایڈیٹر مولانا بدرالحسن قاسمی دارالعلوم اور الداعی سے قطع تعلق کرکے کچھ دن برزخی زندگی گذار کر کویت تشریف لے گئے، ایسے میں مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ضرورت محسوس کی کہ مولانا کو الداعی کے ایڈیٹر کی حیثیت سے دارالعلوم بلالیا جائے؛ چنانچہ مولانا نے اپنی علمی عبقریت وعظمت کی وجہ سے مادر علمی میں اپنی جگہ بنالی اور الداعی کی ایڈیٹر کی حیثیت سے دارالعلوم چلے آئے، یہاں بحال ہونے کے بعد مولانا تدریب کے لیے سعودی عرب تشریف لے گئے اور کئی ماہ وہاں مقیم رہے، اس دوران میرا قیام دارالعلوم دیوبند میں تھا اور دارالافتاء میں بحیثیت طالب علم داخل تھا، مولانا وحیدالزماں کیرانوی سے قربت بھی تھی، اس لیے مولانا کے غائبانہ میں الداعی کا کام میرے درسی ساتھی مولانا عتیق اللہ قاسمی سہرساوی دیکھنے لگے اور نظر نہائی کا کام حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ خود کیا کرتے تھے، مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب کی واپسی کے بعد مولانا عتیق اللہ قاسمی صاحب شیخ الہند اکیڈمی منتقل ہوگئے اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی زیر نگرانی ''الدراسات العلیا'' کے نام سے عربی رسالہ نکالنے لگے، بعد میں مولانا عتیق اللہ قاسمی کی خدمت امارت شرعیہ کو حاصل ہوگئی اور

چند سال کے بعد عارضہ قلب میں پٹنہ میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا تدریب سے لوٹنے کے بعد الداعی کے ساتھ دارالعلوم میں بحیثیت مدرس بھی خدمت انجام دینے لگے اور عربی زبان وادب خصوصاً تکمیلِ ادب کے اسباق ان سے متعلق ہو گئے، مولانا نے پوری دلجمعی کے ساتھ دونوں کام کو سنبھالا اور عالم عرب کے لیے علماء دیوبند کی کتابوں کو ترجمہ کر کے شائع کیا، علماء دیوبند کے افکار وخیالات کی ترویج واشاعت کے لیے اداریے اور مضامین لکھے، بعض اہم موضوع پر عربی میں کتابیں تصنیف کیں، فلسطین کے مسائل پر توجہ مبذول کرانے کے لیے ''فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں'' لکھ کر اسے شائع کرایا، یہ کتاب عربی واردو دونوں میں شائع ہوئی، کتاب کے افکار وخیالات کی روشنی میں آسام یونیورسٹی سے اس پر اسکالر نے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی اچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مولانا عربی صحافی اور ادیب کی حیثیت سے عالم عرب تک متعارف ہوئے اور ہندوستان والوں نے بھی ان کی عربی نثر کو اعلیٰ ادبی نمونہ قرار دیا۔

اس وقت مولانا کی اردو ادیب کی حیثیت سے کوئی چیز نہیں آئی تھی؛ اس لیے اردو کے ادباء اور فقہ وحدیث کے ماہرین کا حلقہ بقول ان کے ''اِن کو عربی آوے ہے'' سے ہی جانتا تھا؛ لیکن مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ کے انتقال کے بعد ان کی پہلی اردو کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' آئی، مولانا سے عقیدت ومحبت، حق شاگردی اور جدائی کے غم نے اردو ادب میں ایسی کتاب ان سے تصنیف کروادی جو سوا □ ادب کا بہترین مرقع بن گئی، جس کو دل کی آنکھوں سے پڑھا گیا، واقعات وخیالات، جذبات واحساسات کی اتنی صحیح عکاسی کسی دوسری کتاب میں دیکھنے کو نہیں ملی، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ نے اس کتاب کے اسلوب اور حقیقت بیانی سے متأثر ہو کر فرمایا کہ اگر نور عالم جیسا شاگرد ہو تو مرجانے میں ہی فائدہ ہے۔

اس کے بعد مولانا نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا، حرف شیریں، پس مرگ زندہ، رفتگان نارفتہ، فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں، صحابہ رسول اسلام کی نظر میں، کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے، عالم اسلام کے خلاف صلیبی اور صہیونی جنگ۔ حقائق ودلائل، خط رقعہ کیسے لکھیں جیسی اہم کتابیں دنیائے علم وادب کو دیں، ان کتابوں میں تاریخ بھی ہے، ادب بھی ہے، خاکے بھی ہیں، عالم اسلام کا درد وکرب بھی ہے، اسلام کی حقانیت کو عصری زبان میں ثابت کرنے کی لائقِ تحسین کوشش بھی ہے، سب کتابوں میں اعلیٰ ادبی تعبیرات اور پرکشش جملے دامن دل کو کھینچتے ہیں اور آدمی اس کے مطالعہ پر خود کو

مجبور پاتا ہے، کہنا چاہیے کہ مولانا نے تاریخی ذوق مولانا سید محمد میاں صاحبؒ سے حاصل کیا تھا اور ادبی ذوق نیز نستعلیقی رہن سہن کا طریقہ مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ سے سیکھا تھا، عربی تو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی، اس زبان میں ان کی تصنیفات کی تعداد سات بتائی جاتی ہے؛ جب کہ انہوں نے پچیس کتابوں کا اردو سے عربی میں ترجمہ کیا، جن میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مفتی محمد تقی عثمانی، قاری محمد طیب، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا منظور احمد نعمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر خورشید احمد صاحبان وغیرہ کی تصانیف شامل ہیں، ان کے علاوہ برصغیر ہندوپاک کے رسائل اور عالم عرب کے عربی مجلّات میں پانچ سو سے زائد علمی وادبی مقالے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ مولانا کی عربی زبان وادب کی خدمات کا حکومتی سطح پر اعتراف کیا گیا؛ چنانچہ ۲۰۱۸ء میں موجودہ صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے ''صدارتی توصیفی سند'' سے نوازا۔

مولانا سے میرے تعلقات کی نوعیت استاذی وشاگردی کی نہیں تھی؛ اس لیے ان کی درسی خصوصیات پر میرے لیے کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے، وہ جب دارالعلوم تشریف لائے تو میں افتاء میں تھا اور افتاء کی تکمیل کے بعد میں وطن واپس ہوگیا، مولانا سے فون پر رابطہ رہا، بیش تر کسی کام سے ان کا ہی فون آتا، میں ایسے ہی فون کرنے میں کوتاہ واقع ہوا ہوں، حضرت امیر شریعت مولانا محمد ولی رحمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ آپ تو پہلے استخارہ کریں گے، پھر دو رکعت نماز پڑھیں گے تب مجھ کو فون کرنے کی سوچیں گے؛ ایسا ہی کچھ مولانا سے رابطہ میں ہوا کرتا تھا؛ لیکن مولانا نہیں بھولتے تھے، میرے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد کہیں کوئی تاریخی سقم سمجھ میں آتا تو فوراً فون کرتے، حوصلہ افزائی فرماتے پھر اس غلطی کی نشان دہی کرتے، میں جب کبھی دیوبند جاتا تو ملاقات کا وقت دیتے، ناشتہ کراتے، اندازہ ہوتا کہ یہ وقت بھی انہوں نے میری دل جوئی کے لیے نکالا ہے، ورنہ ان کے نظام الاوقات میں ملنے ملانے کی گنجائش کم ہی ہوتی تھی۔ مولانا سے میری آخری ملاقات امارت شرعیہ پٹنہ میں ہوئی تھی، وہ وفاق المدارس الاسلامیہ کے تدریب المعلمین کے پروگرام میں میری دعوت پر تشریف لائے تھے، یہ تین روزہ پروگرام تھا اور المعہد العالی کے ہال میں منعقد ہوا تھا، مولانا نے عربی درس وتدریس اور انشاء کے حوالہ سے کئی محاضرے دیئے، پہلا محاضرہ ان کا ''استحضار نیت'' پر تھا، پھر ''عربی بولنے لکھنے کے طریقے'' پر بھی روشنی ڈالی، فرمایا: اگر عربی اور اردو میں مضمون لکھنا چاہتے ہو تو ڈائری پابندی سے لکھو، اور اس کے لکھنے کا طریقہ مولوی ثناء الہدیٰ سے سیکھو، میں نے ''وہ کوہ کن کی بات'' میں ان کی ڈائری سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے دوسرے ایڈیشن میں بہت کچھ ان کے مضمون کیمپ ڈائری

کے چند اوراق سے حوالہ کے ساتھ نقل کیا ہے، مولانا کا اتنا کہہ دینا میرے لیے باعثِ سعادت بھی ہے اور سند بھی۔ مولانا نے اس موقع پر جو محاضرے دیئے، اسے کیسٹ سے نقل کرا کر میں نے ان کی خدمت میں نظر ثانی کے لیے بھیجا تھا؛ مگر مولانا اس کے لیے وقت نہیں نکال سکے مجبوراً میں نے تقریر کو اسلوب تحریر دے کر اپنی کتاب ''مدارس اسلامیہ میں منصب تدریس اور طریقہ تدریس'' میں شامل کر دیا تھا، جو مطبوعہ شکل میں موجود ہے، یہ آخری ملاقات تھی جو آمنے سامنے مولانا سے ہوئی، اس کے بعد پھر کوئی ملاقات یاد نہیں؛ حالانکہ ابھی کوئی چار ماہ قبل وہ بہار آئے تھے جو ان کا آخری سفر بن گیا۔

میرا فون پر آخری بار رابطہ ان سے ۲۰۱۹ء میں ہوا تھا، ان کی لڑکی کا رشتہ چکنوٹہ ویشالی کے ایک خاندان میں لگا تھا، وہ لوگ مقیم تو دہلی میں تھے؛ لیکن رہنے والے ویشالی کے تھے، مولانا نے بغرض تحقیق مجھے فون کیا، اور فرمایا کہ جب بھی آپ کو فون کرتا ہوں، کوئی نہ کوئی غرض اپنی شامل ہو جاتی ہے، پھر انہوں نے میرے ذمہ تحقیق کا کام کیا، میں نے تحقیق کے بعد حضرت کو خبر دی؛ چنانچہ یہ رشتہ پایۂ تکمیل کو پہونچا، مولانا نے اس کے لیے شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ جب بھی ادھر آیا، آپ کے گھر ضرور آؤں گا، مولانا کا ادھر کا سفر نہیں ہوا، محرومی میرا مقدر رہی اور مولانا نے رخت سفر باندھ لیا، اب ملاقات قیامت ہی میں ممکن ہے، اللہ مولانا مرحوم کو بہتر بدلہ عطا فرمائے! سیئات سے درگذر فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے! جہاں تک جدائی کے صدمہ کی بات ہے تو حقیقت یہ ہے کہ

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

❁ ❁ ❁

مولانا نور عالم خلیل امینی: رفتید ولے نہ از دل ما

از: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی

حضرت الاستاد مولانا نور عالم خلیل امینی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے، وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی، ہائے یہ کیا ہوا، چند روز قبل ہی خاصی طویل بات ہوئی تھی، شخصیات کے جوار دو ترجمے ہم نے بھیجے تھے، ان کی وصول یابی کی رسید کے طور پر انھوں نے فون کیا تھا اور بے شمار دعائیں دی تھیں، اتنی دعائیں کہ میں آمین اور شکریہ کہتے کہتے تھک گیا، ان کی زبان نہ رکی اور نہ تھکی؛ مگر ایک دو روز بعد ہی ان کی علالت کی خبر سوشل میڈیا پر گردش کرنے لگی، یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ مولانا مجموعۂ امراض ہیں، شوگر تو ان کا دائمی رفیق ہے، اسی کے عوارض وعواقب سے دوبدو ہوں گے، علاج ہوگا اور ٹھیک ہوجائیں گے، ان کے چھوٹے فرزند ثمامہ نور سے اس کی تصدیق کی تو انھوں نے بھی سر ہلایا اور دعائے صحت کی درخواست کی۔ فرزندوں نے سعادت کا ثبوت پیش کیا، علاج معالجے کی ساری کوششیں روبہ عمل لائی گئیں، گھر سے لے کر ہسپتال تک ان کی دوا دارو میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی، صحت یابی کی خبر ملتی تو دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا اور پھر کچھ وقفہ سے صحت روبہ زوال ہونے کی خبر گردش کرتی تو دل بیٹھ جاتا، زبان پر بے اختیار یا سلام کا ورد جاری ہوجاتا، تقریباً پندرہ روز تک مرض وصحت کی یہ آنکھ مچولی چلتی رہی، کبھی مرض غالب آ گیا تو کبھی صحت نے یاوری کی، جب بھی انٹرنیٹ آن کرتا تو ہاتھ کانپتے اور سانسوں کی آمد ورفت تیز ہوجاتی، ۱۹ر رمضان کو بوقت سحر نیند سے بیدار ہوا تو یہی کیفیت تھی، انٹرنیٹ آن کیا تو وہی ہوا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، فیس بک پر ان کی وفات کی جان کاہ خبر دیکھی تو دل مسوس کر رہ گیا، آدمی تو عیار ہے، ہزار بہانے ڈھونڈتا ہے، اپنے آپ کو تسلی دی کہ ہو نہ ہو یہ خبر جھوٹی ہو اور پھر کوئی ایسی خبر مشتہر ہو، جس میں ان کی صحت کا مژدہ جاں فزا سننے کو ملے؛ مگر جب یہ خبریں تواتر سے آنے لگیں تو یقین ہوگیا کہ حضرت الاستاد نے ہمیں الوداع کہہ دیا،

نورعالم نور آخرت بن گیا، وہ ستارہ غروب ہوگیا جس کی روشنی سے ہمارے دل و دماغ منور و مجلّٰی ہوتے تھے۔ فوراً کلمات ترجیع کہے اور چند تعزیتی جملے لکھ کر ثمامہ کو واٹس ایپ پر بھیج دیے اور پھر یادوں باتوں کے طلسمی جہان میں کھو گیا، غم والم کا جھونکا اتنا شدید تھا کہ سحری کے گنے چنے لقمے بھی حلق سے نیچے نہیں اتر رہے تھے۔ ان کی موت بجلی کے سخت کڑکے کی طرح مجھے جھنجھوڑ گئی، یہ سوچ کر ہی کلیجہ منہ کو آتا تھا کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے، پوری علمی دنیا کو وہ سوگوار کر کے چلے گئے، آہ! عجم میں عربی زبان آج پھر سے یتیم ہوگئی، جس کی یتیمی کے احساس کو انھوں نے مولانا علی میاں ندوی کے انتقال کے بعد اپنی شائستہ وشگفتہ ادبی اور البیلی تحریروں سے دور کیا تھا اور برصغیر میں اس کے سر پر اپنا دست شفقت رکھا تھا۔

پہلی ملاقات اور عرصۂ شاگردی:

مولانا مرحوم سے میں تقریباً بیس برس تک وابستہ رہا اور اخذ واستفادہ کا سلسلہ کبھی رکا یا تھما نہیں، میں نے سیکھنے میں کوتاہی کی؛ مگر مولانا نے سکھانے میں کبھی حیلہ حوالہ سے کام نہیں لیا۔ مولانا اپنی اصول پسندی کے باوجود، ایک کھلے گھر کی طرح تھے، جب چاہیے دستک دے کر قدم اندر ڈال دیجیے۔ میں نے بھی حتی المقدور ان کے منبع علم سے تشنگی دور کی، جب کوئی سوال ذہن میں کلبلایا، مولانا کے وقت کا خیال کر کے فون کیا اور اپنا عندیہ پیش کر دیا، عربی اردو کی پیچیدگی دور کر لی، مولانا سے میری باضابطہ شاگردی کا عرصہ پورے تین سال پر محیط ہے، یہ سعادت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہوگی کہ باقاعدہ دارالعلوم میں داخل رہ کر تین سال تک مولانا کی شاگردی کے سلسلے سے منسلک رہا ہو۔ راقم ۲۰۰۰ء میں ششم عربی میں داخل ہوا، پہلی بار اتنے بڑے مدرسہ میں داخلہ کا احساس ہی عجیب فرحت بخش تھا اور ایک دور افتادہ اور مفلوک الحال طالب علم کو تنگ نائے سے نکل کر، اس وسیع وعریض صحن میں قدم رکھنے کی جگہ مل جائے تو اس کی خوشی کا کیا ٹھکانہ، جو لوگ دارالعلوم کے تدریسی نظام سے واقف ہیں، انھیں معلوم ہوگا کہ طلبہ کی کثرت تعداد کے پیش نظر، دورۂ حدیث کو چھوڑ کر باقی درجات کو کئی چھوٹے چھوٹے گروپ میں منقسم کیا جاتا ہے۔ ششم عربی کے بھی تین گروپ ہوتے ہیں، ششم اولیٰ، ششم ثانیہ اور ششم ثالثہ۔ نتیجہ شائع ہونے کے بعد دفتر اہتمام کے سامنے بورڈ پر جو فہرست آویزاں ہوئی، اس میں میرا نام ششم ثانیہ میں مندرج تھا، میں ان گروپوں کی سیاست اور ان کی افادیت وعدم افادیت سے یکسر ناواقف تھا۔ ہم تو ایک درجے میں پڑھنے کے عادی رہے تھے۔ یہ گروپ کیا بلا ہوتی ہے بھائی۔ اکثر قدیم طلبہ ششم اولی اور ششم ثالثہ میں اپنا نام دیکھنے کے متمنی

ہوتے ہیں، طلبہ کی زبان پر یہ چرچے عام تھے کہ فلاں گروپ میں جلالین مفتی محمد راشد اعظمی پڑھاتے ہیں، جن کی تفسیری صلاحیت غضب کی ہے، فلاں گروپ میں میبذی کا درس امام المنطق مولانا خورشید انور گیاوی دیتے ہیں، مباحث ومسائل گھول کر پلا دیتے ہیں، اور فلاں گروپ میں متنبیؔ کا درس فلاں ادیب اریب دیتے ہیں، جن کے منہ سے ادب کا سوتا ابلتا ہے۔ اسی طلب میں بہت سے طلبہ سفارش کرا کرا اپنا نام مطلوبہ گروپ میں لکھوا لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ششم اولیٰ اور ششم ثالثہ میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، ششم ثانیہ میں دونوں گروپوں کی بہ نسبت طلبہ کی تعداد کم ہوتی ہے، کیوں کہ اس گروپ میں انتظامیہ کی طرف سے جو نام شامل ہوجائے بس وہی طلبہ رہتے ہیں، کسی اضافی نام کا اس میں اندراج نہیں ہو پاتا۔ ششم ثانیہ میں بظاہر ایسی کوئی خاص بات بھی نہ تھی کہ اس گروپ میں طلبہ اپنا نام شامل کرانے کے لیے مسابقت کا جذبہ دکھائیں، اس گروپ میں جلالین کا درس علامہ محمد جمال صاحبؒ دیتے تھے، جنھوں نے کئی جلدوں میں جلالین کی شرح لکھی اور میبذی مولانا عبدالرحیم بستوی صاحبؒ سادہ انداز میں پڑھاتے تھے اور ہدایہ کے مسائل اپنی سادہ اور مختصر روایتی زبان میں مولانا شبیر احمدؒ سمجھاتے تھے، جس میں صرف ترجمہ ہوتا تھا، تشریح برائے نام ہوتی تھی۔ پیر خود فقیر تو درگاہ کہاں سے لگائے، مجھے تو اپنے سارے اساتذہ بہت ہی لائق وفائق دکھے، کبھی کسی استاد کو کمتر نہیں سمجھا اور میں نے بلاناغہ سارے اسباق کی پابندی کی، مگر یہ تینوں مذکور الصدر اساتذہ طلبہ میں اپنی تدریس کی بنیاد پر نہ جانے کیوں اتنے مقبول نہ تھے، اس ترتیب یعنی گروپ کا دارالعلوم کے حساب سے صرف ایک امتیاز تھا کہ اس میں ادیب دوراں اور مولانا کیرانوی کے شاگرد رشید مولانا نور عالم خلیل امینی دیوان متنبیؔ کا درس دیتے تھے، یہ بات طلبہ کو بھی اچھی طرح معلوم تھی اور وہ بھی اس گروپ میں آ کر اس گھنٹے میں چپکے سے بیٹھ کر مولانا سے استفادہ کرتے تھے، اس ترتیب کے ساتھ ایک مسئلہ بھی تھا اور بہت گمبھیر، اس میں اس لیے بھی طلبہ اپنا نام لکھوانے سے کتراتے تھے کہ ظہر کی نماز کے بعد کا پہلا گھنٹہ مولانا کے درس کے لیے مخصوص تھا، جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ ایک تو ہمارے مدارس میں قیلولہ کی وہ لت پڑی ہوئی ہے کہ طلبہ ہی نہیں، اساتذہ بھی دوپہر کا کھانا کھا کر ایسے سوتے ہیں کہ یہ قیلولہ لیلولہ بن جاتا ہے اور اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ اللہ کی پناہ، گھوڑا بیچ کر سونے والا مقولہ تازہ ہوجاتا ہے۔ ایسی نیند کہ رات کی نیند بھی شرم کے مارے پانی پانی ہوجائے۔ اس قیلولہ کی سنت کو زندہ کرنے میں اکثر کی فرض نماز یعنی ظہر بھی قضا ہوجاتی ہے، مولانا وقت کے اتنے پابند تھے کہ ادھر پانچویں گھنٹہ کی ٹن ٹن کی آواز کانوں میں پڑتی اور ادھر مولانا عمدہ قسم کی شیروانی میں ملبوس

شان وشوکت کے ساتھ دائیں بائیں دوطلبہ کی معیت میں درس گاہ میں قدم رنجہ ہوجایا کرتے تھے، ان کے درس گاہ میں داخل ہونے کے بعد پھر کسی طالب علم کے لیے درس گاہ میں انٹری بالکلیہ ممنوع تھی۔

میں پہلی بار مولانا کے نام سے آشنا ہوا تھا، دارالعلوم کے در و دیوار پر ان کی زبان دانی اور عربی دانی کا شہرہ عام تھا، میں نے اس کو غنیمت جانا اور پھر میں ایک غریب طالب علم کہاں جاتا، جس کا نہ کوئی سرپرست تھا، نہ درسی ساتھی اور نہ کوئی سینئر ہی تھا، جو رہ نمائی کرتا، میں تو کئی زینہ پھلانگ کر عربی ششم میں زبردستی گھس آیا تھا، آدھا ادھورا عربی چہارم کے بعد سیدھے عربی ششم میں جیسے ایک کنارے لٹک گیا تھا، اس لیے جہاں سیٹ مل گئی، اسی پر گزارا کرلیا، اللہ اللہ خیر صلا۔ اتفاق سے میرا کمرہ بھی ششم ثانیہ والی درس گاہ کے مشرقی جانب بالکل سامنے واقع تھا، میں دار جدید ۱۲۰ نمبر کمرہ میں رہتا تھا، کئی بار تو ایسا ہوا کہ ظہر کی نماز پڑھے بغیر ہی دیوان متنبّی اور ایک کاپی قلم لے کر بھاگتا ہوا درس گاہ میں پہنچ گیا، بہت اہتمام کے ساتھ نہ صرف متنبّی کے اشعار کا ترجمہ، بلکہ مولانا کی ایک ایک بات اور لفظ و جملے کو بھی نوٹ کرتا جاتا تھا۔ بات بیس برس پرانی ہوگئی، مجھے یاد نہیں کہ متنبّی کا ایک درس بھی میں نے ناغہ کیا ہو، شاید ایک دن درس سے غیر حاضر رہا، وجہ وہی ہوئی کہ میں جب تک درس گاہ پہنچتا، مولانا اپنے جاہ و جلال کے ساتھ درس گاہ میں براجمان تھے، میں رجعت قہقری پر مجبور ہوگیا۔

مولانا طلبہ کو درس کا پابند بنانے کا التزام کرتے تھے اور بلا وجہ غیر حاضری پر سخت سرزنش کرتے تھے۔ جب وہ غیر حاضری یا تاخیر پر کسی کو ڈانٹتے تھے، تو وہ وقت دیدنی ہوتا تھا، جب غصہ میں ہوتے تو مولانا کے ہونٹ خشک ہوجاتے، شوگر کی وجہ سے زبان لگنے لگتی، چشمہ کے پیچھے سے مولانا کی بڑی بڑی آنکھیں اتنی سرخ ہوجاتیں اور اتنی ابھر آتیں کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے، بہتوں کا پیشاب بھی خطا کرجاتا تھا۔ کیا مجال کہ مولانا ڈانٹ رہے ہوں اور کوئی طالب علم لب کشائی کرجائے۔ غیر حاضری پر کوئی عذر سننے کے لیے وہ تیار نہ ہوتے۔ مولانا شوگر کے دائمی مریض تھے، اس زمانے میں پچاس کے لپیٹے میں تھے، داڑھی بھی کھچڑی تھی، چال بہت بارعب تھی، گھوڑے کی ٹاپ کی طرح ان کے پالش سے چمکتے ہوئے جوتے فرش پر بچھی ہوئی اینٹوں سے ٹکراتے تھے، جب وہ صدر دروازے سے داخل ہوتے تو تمام طلبہ انھیں دیکھتے رہ جاتے، جو جہاں ہوتا وہیں رک جاتا تھا، جب وہ گھورتے تو یہ آنکھیں طلبہ کے اندر تیر کی طرح پیوست ہوجاتی تھیں۔ خیر جیسے ششم کا یہ سال مکمل ہوگیا، ششم میں دیوان متنبّی کے منتخب ابواب کا درس دیا جاتا ہے اور یہ کلاسیکی ادب کی کتاب ہے، جس میں عربی کے جدید رنگ و روپ پر بات کرنے کا موقع ذرا کم میسر آتا ہے، مگر میں نے محسوس کیا کہ مولانا موقع

محل کی مناسبت سے طلبہ کے اندر عربی کے جدید رنگ و آہنگ سے بھی مناسبت پیدا کرنا چاہتے ہیں، مولانا کتاب میں ڈوب کر پڑھاتے تھے، عربی کے ساتھ اردو کے ہم معنی اشعار بھی طلبہ کو سناتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ اشعار و الفاظ سے وہ خود پہلے محظوظ ہوتے تھے، اس کے مزے لیتے تھے اور اس کے بعد طلبہ میں اس کی ترسیل کرتے تھے، کبھی انھیں عربی زبان کی اہمیت بتا رہے ہیں، کبھی انھیں اعراب اور ترکیب کی اغلاط پر کوس رہے ہیں، اور ان کی خفتہ و خوابیدہ صلاحیت کو بیدار کرنے کے ہزار جتن کر رہے ہیں۔

میں تو پہلی بار ان کی شخصیت و سراپا سے روشناس ہوا تھا، مگر جو طلبہ قدیم تھے اور ان سے واقف تھے، وہ ان کی عربی اور اردو کا چرچہ کرتے رہا کرتے تھے، ان دنوں ان کی دو کتابوں کا شہرہ سنا، ایک حرف شیریں اور دوسری وہ کوہ کن کی بات۔ دونوں کتابیں اسی سال پڑھیں اور جی لگا کر پڑھیں، ایک بار نہیں، مکرر سکرر پڑھیں، اسی طرح لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا، لکھنے کی کوشش کی، مگر نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب۔ مولانا کے طویل ترین جملوں، ان کی ادق اور مشکل تعبیرات کو سمجھنا ہی ہم جیسے مبتدیوں اور ضعیف الاستعداد کے لیے کارِ محال تھا، اس جیسا لکھنا تو جوئے شیر لانا تھا؛ مگر مولانا کی شخصیت اور ان کی زبان و بیان سے اتنا متاثر ہوا کہ اکثر عصر بعد ان کی مجلس میں بھی حاضر ہونے لگا۔ مسجد قدیم یا چھتہ مسجد میں عصر کی نماز پڑھتا اور سر پر پیر رکھ کر ان کے گھر کی طرف چل پڑتا، وجہ یہ تھی کہ ہر طالب علم ان کی مجلس میں حاضر باش رہنے کا متمنی ہوتا، اور مولانا کے برآمدے میں یہی کوئی دو تخت پر مشتمل جگہ ہوتی جس پر زیادہ طلبہ کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ آٹھ دس طالب علم سے زیادہ ہوتے تو کبھی کرسیاں بھی منگا لیتے؛ مگر جب طلبہ کا ہجوم زیادہ ہوتا تو انھیں کل آنے کے لیے کہہ کر دروازے سے ہی رخصت کر دیتے۔ دیکھتا کہ سبھی طلبہ ایک دم خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہیں، شہر خموشاں جیسی خاموشی، جو طلبہ قدیم ہوتے، مولانا کی اصول پسندی سے آشنا ہوتے، وہ ان کی نزاکت و نفاست کا چرچہ کر رہے ہیں، ان کے آدابِ مجلس کا بکھان کر رہے ہیں، چپل اور جوتے کہاں اتارنے ہیں؟ چائے کیسے پینی ہے؟ کپ کیسے پکڑنا ہے؟ بسکٹ کیسے کھانی ہے؟ مصافحہ کیسے کرنا ہے؟ بات کس طرح کرنی ہے؟ انھیں کیسے خطاب کرنا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں غریب طالب علم جو اپنے ساتھیوں میں اکلوتا بھاگ کر دیوبند پہنچ گیا تھا اور ذرا منہ کا چور بھی ہوں، ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر، صرف سنی بنا پیچھے دبک کر بیٹھا رہتا، کچھ دیر بعد مولانا کا حجرہ سے نزول ہوتا، تخت پر ہی کنارے بیٹھ جاتے، سبھی کا نام پتہ اور درجہ پوچھتے، کوئی اپنے علاقے کا ہوتا تو بات علاقائی احوال کی طرف مڑ جاتی اور اپنی میتھلی آمیز

زبان ''رے چھوڑا'' کہہ کرلنگوٹیایار کی طرح بات کرنے لگتے۔ میں تکمیل ادب سے پہلے جتنے دن بھی ان کی مجلس میں حاضر ہوا، خدا گواہ ہے کہ مولانا نے کچھ پوچھا تو اس کا جواب دے دیا، ازخود کبھی کچھ پوچھنے یا بولنے کی ہمت نہ کرسکا۔

سال ہفتم اور دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد عربی ادب کا شوق ذرا چرایا، تو تکمیل ادب میں داخل ہوگیا، میں سال ششم سے ہی اردو میں مضامین اور مراسلے لکھنے لگا تھا اور کبھی اچھا مال تیار ہوگیا تو اپنے نام سے چھپوا دیا اور کبھی مال ذرا کچا رہ گیا تو دوسرے فرضی نام سے بھی اخبار کو بھیج دیتا، مقصد صرف اپنا نام یا اپنی تحریر کی روشنائی میں دیکھنا ہوتا۔ نئی دنیا، راشٹریہ سہارا یہی دو اخبار اس زمانے میں زیادہ رائج تھے، قومی آواز کی شکل وصورت ذرا بھدی تھی؛ اس لیے کبھی کوئی تحریر اس میں بغرض اشاعت نہیں بھیجی۔ ادھر عربی زبان سیکھنے کا شوق بھی انگڑائی لے رہا تھا، ششم کے سال میں ہی عربی انجمن النادی الادبی سے جڑ چکا تھا، اس کے پروگرام میں پابندی سے شریک ہوتا اور ٹوٹی پھوٹی تقریری وتحریری مشق بھی کرنے لگا تھا؛ مگر میری استعداد ذرا کمزور تھی، عربی قواعد تک سے ناآشنا تھا، بس عربی اول میں نحو قاسمی اور میزان میں جو کچھ آدھا ادھورا پڑھا تھا، اس کی روشنی میں عربی کی موٹی موٹی باتیں جانتا تھا، اس لیے تکمیل ادب میں داخلے کا شوق اور تیز ہوگیا؛ تاکہ میری عربی کی استعداد مضبوط ہوسکے۔ تکمیل ادب میں طلبہ کم ہوتے ہیں اور مولانا کا مختارات کا درس بہت مشہور تھا کہ جس نے مختارات، جو اخباری تراشوں پر مبنی ہے مولانا سے پڑھ لی، وہ اخباری عربی پڑھنے اور لکھنے پر قادر ہوجاتا ہے۔ اس سال مولانا سے سیکھنے کا موقع زیادہ ملا۔ مولانا کا انداز درس بھی بہت منفرد اور البیلا تھا۔ وہ اپنے استاد مولانا کیرانوی کے ہر معاملے میں عاشق تھے اور عربی تدریس کے معاملے میں تو وہ ان کے انداز واطوار کے دیوانے تھے، مولانا سبھی طلبہ کو درس میں مشغول منہمک دیکھنا چاہتے تھے، کسی طلبہ کی ذراسی غفلت اور لاپرواہی پر وہ آگ بگولہ ہوجاتے تھے اور ایسی ڈانٹ لگاتے تھے کہ اس کے چودہ طبق روشن ہوجاتے تھے۔ وہ درس گاہ میں ایک کمانڈر کی طرح تھے، موٹے چشمے کے پیچھے سے اگلی پچھلی صف تک نظر رکھتے تھے، سبھی کی حرکات وسکنات سے باخبر رہتے تھے، کسی کو بھی عبارت خوانی کا اچانک حکم دیتے تھے، مولانا کے ہاں عبارت خوانی میں عربی لہجے کی پابندی فرض کی حد تک ضروری تھی، اعراب اور قواعد کی غلطی کو وہ برداشت کرلیتے تھے؛ مگر کوئی لہجے میں خطا کرجائے یہ بات ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ عربی کو اردو میں پڑھنے پر سخت ناراض ہوتے تھے۔ ششم میں عبارت پڑھنے کا موقع ہاتھ نہیں لگا؛ مگر اس سال مجھے بھی عربی عبارت پڑھنے کا موقع ملا اور جب

جملہ سازی کی باری آئی، تو کئی بار مولانا نے تحسینی کلمات بھی کہے۔ مولانا طلبہ کو پوری مختارات از بر کرادیتے تھے، وہ کتاب میں آنے والے جملوں اور ترکیبوں کی بخیہ ادھیڑنے کے قائل تھے، وہ کہتے تھے کہ جملوں کو الٹنے پلٹنے کی عادت ڈالیے، ماضی کو مضارع، مضارع کو ماضی بنایئے، صیغوں کی شکلیں بدلیے، مبتدا اور خبر کو تبدیل کیجیے اور اس جملے کی ایسی حجامت بنایئے کہ اس کی نانی یاد آجائے۔ مولانا کے اس انداز سے ایک ہی تعبیر پر مشتمل دسیوں مختلف جملے درس گاہ میں بن جاتے تھے۔ دوسرے طلبہ درسی قسم کا یا کوئی ایسا جملہ بناتے، جس سے قدامت اور فرسودگی کی بوآتی، مولانا ہوں ہاں کرکے آگے بڑھ جاتے؛ مگر میں ایسے جملے بناتا تھا جس سے جدت کا پہلو برآمد ہوتا تھا۔ مختارات میں ایک خبر ہے، اس کے ایک جملے میں اعوز یعوز (بمعنی کم ہونا، ناپیدا ہونا) آیا ہے، جب یہ جملہ آیا تو مولانا نے طلبہ سے درخواست کی کہ اس کے پیٹرن پر دوسرے جملے بنایئے، مطلب صرف فعل کو باقی رہنے دیجیے اور باقی تمام چیزوں کو تبدیل کردیجیے۔ سبھی نے رسمی قسم کے مختصر جملے بناکر اپنا پیچھا چھڑالیا، میں نے اردو کے ایک مشہور اخباری جملے سے متاثر ہوکر عربی میں یہ جملہ بنایا ''القانون الدولی الموحد یعوزہ القانون الاسلامی'' مولانا میرے مصنوعی عربی لہجے میں یہ جملہ سن کر بہت خوش ہوئے، دعائیں دی اور کہا کہ بہت اچھا، بالکل الگ قسم کا جملہ تم نے بنایا ہے۔ محنت کرو، آگے جاؤگے!

❁ ❁ ❁

شمعِ روشن بجھ گئی، بزمِ سخن ماتم میں ہے

(آبروئے قرطاس وقلم، عربی واردو کے مشہور ومعروف ادیب، بے مثال وباکمال استاذ ومربی، استاذ محترم مولانا نور عالم خلیل امینی -نوراللہ مرقدہ- کی شخصیت کے امتیازات وخصوصیات اوران کے دروس ونگارشات سے متعلق ایک تاثراتی تحریر)

بہ قلم: مولوی محمد ذکوان دیوبندی
متعلّم دارالعلوم دیوبند

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت

علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے ان اشعار کا لفظ لفظ حالاتِ حاضرہ پر منطبق اور کوائفِ تازہ کی مکمل عکاسی اور صحیح منظر کشی کررہا ہے، واقعی عالمِ آب و گل میں اس وقت موت مانندِ ''نسیم'' ارزاں ہو چکی ہے، گلشنِ ہستی پر خزاں کا حملہ بڑا شدید ہے، موت کی ایسی آندھی چلی ہے کہ علم وعمل کے چراغ بجھتے چلے جارہے ہیں، ہر صبح اپنے جلو میں نویدِ مسرت کے بجائے پیامِ الم لے کر آتی ہے، ہر شب اپنے دامن میں مژدۂ سکون و عافیت کے بجائے رنج وغم کی سوغات لیے نمودار ہوتی ہے، ہر صبح خورشیدِ جہاں تاب کی کرنیں کسی ''گوہر شب چراغ'' کے گل ہونے کی خبر دیتی ہیں، اور ہر رات کا اندھیرا قافلۂ زیست سے کسی مسافر کے بچھڑ جانے کی خبر دیتا ہے، گردشِ زمانہ ہر قدم پر ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ چمنستانِ ارضی کی ہر بہار خزاں نصیب ہے اور اس کی ہر شادابی تغیر پذیر، جہانِ رنگ و بو کی اسی تغیر پذیری کا ایک مظہر گزشتہ ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ ہے، جس دوران نہ جانے کتنے آسمانِ علم وعمل اور آفتابِ فضل وکمال غروب ہوگئے جن کی ضیا پاشیوں سے ایک عالم منور تھا، علوم ومعرفت کے کتنے ہی ایسے چشمے خشک ہوگئے جن سے ایک دنیا سیراب ہورہی تھی، بہ کثرت ایسی ممتاز شخصیات رہروانِ

آخرت میں شامل ہوگئیں جنہوں نے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے، کسی نے مسندِ درس وتدریس پر جلوہ افروز ہوکر قال اللہ اور قال الرسول کا نغمہ سنایا، تو کسی نے اصلاح وتزکیہ کی قندیل فروزاں کرکے ہزاروں گم گشتگانِ راہ کو منزلِ حقیقی سے روشناس کرایا، کسی نے میدانِ سیاست میں اتر کر ملک وملت کے گیسوئے برہم کو سنوارا، تو کسی نے زبان وبیان اور قرطاس وقلم کو میدانِ عمل بنا کر پیامِ حق کو چاردانگِ عالم میں پہنچایا۔

''مسافرانِ آخرت'' میں شامل ہونے والی ان ہی ممتاز شخصیات میں سے ایک: آبروئے قرطاس وقلم، عربی واردو کے بصیرت مند معروف ادیب، یکتائے روزگار معلم حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی ''حسن تربیت'' کے ''عکسِ جمیل''، بے مثال مربی اور باکمال مدرس حضرت استاذ محترم مولانا نور عالم خلیل امینی -نور اللہ مرقدہ- کی ذات گرامی بھی ہے۔ آپ کی رحلت صرف ایک فرد کا حادثہ نہیں؛ بلکہ قرطاس وقلم کے ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ آہ! اب وہ قلم خاموش ہوگیا جو صحرائے بے کنار میں بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم کا پتہ دیتا تھا، الفاظ وحروف کی وہ مشعل بے نور ہوگئی جو دشت وبیاباں میں علم وادب کے چراغ روشن کرتی تھی، وہ خامۂ حقیقت رقم ساکت ہوگیا جو سوئے ہوئے ضمیروں میں حوصلۂ سرفروشی اور ٹھٹھرے ہوئے اعصاب میں جرأت وبے باکی کی برقی لہر دوڑا دیا کرتا تھا۔

آپ محض ایک روایتی طرز کے ''ادیب'' نہیں تھے؛ بلکہ پختہ فکر کے مالک بابصیرت عالم بھی تھے اور ''دلِ دردمند'' اور ''فکرِ ارجمند'' کے حامل دیدہ ور مفکر بھی۔ ان کا ساز اگرچہ ''زخم ہائے عجم'' کا ستم رسیدہ رہا؛ لیکن وہ ''ذوقِ وفا'' کے ایسے شہید تھے جس کی نوا ہمیشہ عربی رہی۔ عربی زبان وادب کی خدمت اور اس راہ میں آبلہ پائی ہی کو انھوں نے اپنی حیاتِ مستعار کا مقصد بنایا تھا اور پھر ''جہدِ مسلسل'' اور ''سعیِ پیہم'' کے ذریعہ شہرت، مرجعیّت اور اعتبار کا وہ مقام حاصل کیا جو ساکنانِ عجم کے لیے باعثِ صد رشک بھی ہے اور سرمایۂ فخر بھی۔

یوں تو ان کی کتابِ زیست کا ورق ورق درخشاں ہے؛ لیکن اس کا سب سے جلی عنوان ''جہدِ مسلسل''، ''سعیِ پیہم'' اور ''ان تھک محنت'' ہے، یہی وہ جوہر ہے جس نے انھیں ''درِّ یکتا'' اور ''گوہرِ نایاب'' بنا کر کامیابی کے بامِ عروج تک پہنچایا۔ اس ''گوہرِ نایاب'' نے دمشق وبغداد، سمرقند وبخارا یا شیراز وخراسان کی مٹی سے نہیں؛ بلکہ ہندوستان کے ضلع مظفرپور کی ایک گم نام سرزمین ''ہرپور بیشی'' کی مٹی سے جنم لیا تھا، صرف تین ماہ کی عمر میں شفقتِ پدری سے محروم ہوگئے تھے، نہ کوئی عظیم خاندانی پس منظر تھا، نہ والدہ محترمہ کے علاوہ کسی کی پشت پناہی حاصل تھی، کم عمری ہی میں نامساعد احوال اور زمانے

کے تلخ حقائق سے سابقہ پڑااوراسی چیز نے انھیں صبر وہمت، جفاکشی اور ریاضت کا عادی بنادیا،قسّامِ ازل نے پیدائشی طور پر ذہانت وفطانت اور مختلف صلاحیتوں سے نوازا تھا، مذکورہ اوصاف نے ان خداداد جوہروں کومزید صیقل کردیااور نتیجتاً وہ حقیقی معنوں میں ''نورعالم'' بن کراسم بامسمی ثابت ہوئے۔

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

ان کی زندگی کا ایک اور نمایاں ترین وصف وقت کی قدر دانی، اس کا انضباط، صحیح استعمال اور نظام الاوقات کی پابندی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وقت کی قدر دانی اور نظام الاوقات کی پابندی صرف درس وتدریس یا تصنیف وتالیف سے وابستہ شخص ہی کے لیے ضروری نہیں؛ بلکہ ہر اس فرد کے لیے امر ناگزیر ہے جو شاہ راہِ زندگی پر کامیابی کا سفر طے کرنے کا خواہاں ہے۔ حضرتؒ کی حیاتِ بابرکات اس حوالے سے بھی نسلِ نو کے لیے ایک نمونۂ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سردی ہو یا گرمی، دھوپ ہو یا برسات، سازگار حالات ہوں یا نامساعد احوال، کوئی چیز بھی ان کے لیے اپنے معمولات کی پابندی اور وقت پر ان کی تکمیل سے مانع نہیں تھی۔ عمر کے آخری چند سالوں میں تو وہ متعدد امراض سے نبرد آزما تھے اور عرصۂ دراز سے ''شوگر'' کی بیماری سے بھی دوچار تھے؛ لیکن بایں ہمہ معمولات کی پابندی میں سرِ موفرق نہیں آیا تھا۔ درس گاہ میں تشریف آوری ہو یا دارالعلوم کے اساتذۂ کرام کی کسی میٹنگ میں شرکت، ایک لمحے کی بھی تاخیر سے پہنچنے کا ان کے یہاں کوئی سوال نہیں تھا۔ وقت کی اسی قدر دانی اور انضباط کا نتیجہ ہے کہ بیماریوں اور امراض کے ہجوم کے باوجود ان کے ''قلمِ زرنگار'' سے ایسی شاہ کار تحریرات وتالیفات وجود میں آئیں جو اسلامی کتب خانے کے لیے ''گنج ہائے گراں مایہ'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔

چوں کہ عربی زبان کی خدمت کے لیے انھوں نے اپنی حیات کو وقف کردیا تھا اور اس حوالے سے بے پناہ جد وجہد اور پیہم محنت ہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا؛ اس لیے صرف تصنیف وتالیف ہی نہیں؛ بلکہ درس وتدریس میں بھی ان کی وابستگی عربی زبان ہی سے رہی؛ چناں چہ دارالعلوم دیوبند میں ان سے دو گھنٹے متعلق رہے، ایک سالِ ششم میں دیوانِ متنبّی اور دیوانِ حماسہ کا، دوسرا تکمیلِ ادب عربی میں ''النشر الجدید'' کا، جس میں ''المختارات العربية'' کا درس دیتے تھے۔ محض اللہ کے فضل وکرم سے راقم حروف کو حضرتؒ سے دونوں جماعتوں میں مذکورہ تمام کتب پڑھنے کی سعادت میسر آئی۔ ان کے درس کی صحیح اور بھرپور منظرکشی اور خصوصیات وامتیازات کی کماحقّہ ترجمانی تو راقمِ آثم

کی باریابی سے بالاتر ہے؛لیکن ان کا ایک ادنی شاگرد ہونے کے ناطے راقم اپنے ذاتی احساسات و مشاہدات اوران کے دروس سے مستفاد تجربات کو بواسطۂ قلم سینۂ قرطاس پر منعکس کرنے کی سعی کررہا ہے۔ممکن ہے سطورِ ذیل میں ان کے میخانۂ علم و ادب سے مئے نوشی کے آداب سیکھنے والے بادہ خواروں کوان کے درس کا دھندلا سا ہی سہی عکس محسوس ہو۔

حضرت سے بالواسطہ استفادہ تو اسی وقت سے جاری تھا جب راقم کی عربی تعلیم کا آغاز ہوا تھا، کچھ ان کی کتابوں (خصوصاً "مفتاح العربية") کی وجہ سے اور کچھ اس بنیاد پر کہ مخدوم مکرم حضرت والدِ گرامی دامت برکاتہم کی زبانی مختلف حوالوں سے بارہا ان کا تذکرہ سننے کو ملتا اور یوں ان سے بلا واسطہ استفادے ومشاہدے سے قبل ہی ان کی عقیدت ومحبت دل میں جاگزیں ہوچکی تھی۔

لقد سمعنا بأوصافٍ لكم كمُلت فسَرَّنا ماسمعناه وأحيانا

من قبل رؤيتكم نِلْنا مودَّتكم والأذن تعشق قبل العين أحيانا

راقم کے لیے اگرچہ ان سے وابستگی "من قبل رؤيتكم" کے قبیل سے تو نہیں تھی؛لیکن "من قبل رؤيتكم بعين البصيرة" کے قبیل سے یقیناً تھی۔علاوہ ازیں خود لفظ "رؤية" نگاہِ بصیرت سے دیکھنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

حضرت سے براہِ راست تلمذ واستفادے کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب راقم کا تعلیمی سلسلہ سال ششم تک پہنچا۔اس وقت طلبہ کی تعداد کی کثرت کے باعث ششم کی جماعت چار حصوں میں منقسم تھی جن میں سے دوسری ترتیب (ششم ثانیہ) میں متنبّی وحماسہ حضرتؒ سے متعلق تھی۔اس میکدۂ علم وادب سے جرعہ نوشی کی دیرینہ آرزو ہمیں بھی ششم ثانیہ تک کھینچ لے گئی اور تشنگی کو 'سیرابی' میں تبدیل کرنے کا حقیقی موقع نصیب ہوا۔

طرزِ تدریس

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے بعد ماضی قریب میں عربی زبان وادب کے حوالے سے جو 'مرجعیت' کا مقام حضرت مولانا نور عالم صاحبؒ کو حاصل ہوا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا، ان کی صرف تصانیف ونگارشات ہی ان کی فنی مہارت کا حوالہ نہیں ہیں؛ بلکہ ان کا درس بھی عربی کے تعلق سے ان کے طویل وعمیق تجربات اور گہری بصیرت کا آئینہ دار تھا۔

دیوانِ متنبّی وحماسہ کے درس میں بنیادی طور پر استاذ کے پیش نظر چار چیزیں رہتی ہیں:اشعار کی ترکیب،مشکل لغات کا حل،ترجمہ اور تشریح،حضرتؒ کے درس کا محور بھی یہی امور تھے؛لیکن ایک الگ

انفرادیت کے ساتھ، گویا شراب کہنہ ضرور تھی؛ مگر ساغر نیا تھا۔ اولاً رجسٹر حاضری میں درج اسمار کی ترتیب کے اعتبار سے چار سے پانچ طلبہ کا نام عبارت خوانی کے لیے پکارا جاتا اور سب کھڑے ہوکر بالترتیب بہ آوازِ بلند عبارت پڑھتے۔عبارت خوانی میں کسی نحوی یا صرفی غلطی کا در آنا تو خیر ہر استاذ کے یہاں ایک قابلِ اصلاح وتنبیہ امر ہے؛ لیکن حضرتؒ کے یہاں علاوہ ازیں مزید دو چیزیں قابلِ توجہ تھیں، ایک عبارت خوانی میں عربی لہجے کا لحاظ؛ چناں چہ طلبہ کو ہمیشہ یہ ہدایت فرماتے کہ عربی زبان کا ایک الگ رنگ وآہنگ ہے، اس کے الفاظ کی ادائیگی میں ایک مخصوص زیر وبم کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر کسی بھی عربی عبارت کا پڑھنا ایک صاحبِ ذوقِ سلیم کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔اسی حوالے سے بارہا یہ جملہ بھی حضرتؒ سے سنا کہ: ''عربی لہجے کی تصحیح کے لیے فنِ تجوید کے مطابق ادائیگی اور اس کے اصول وضوابط کو بروئے کار لانا امرِ ناگزیر ہے؛ بنابریں جو طلبہ پہلے سے فنِ تجوید سے واقفیت ومناسبت رکھتے ہیں ان کا لہجہ عمدہ ہے''۔دوسری چیز یہ تھی کہ ان کے یہاں عبارت خوانی میں برق رفتاری یا تیز گامی موجبِ تنبیہ تھی، میانہ روی؛ بلکہ آہستہ رفتار سے عبارت پڑھنے کی تلقین فرماتے۔جن طلبہ کی عبارت مذکورہ امور پر کھری اترتی ان کو ''جمیل'' ''جمیل'' کے حوصلہ افزا تمغے سے بھی نوازا جاتا۔

بعد ازاں حضرتؒ کے سلسلۂ کلام کا آغاز ہوتا اور خزانۂ علم ادب سے آپ دار نگینے اور جواہر پارے لٹائے جاتے، ہر بادہ خوار اپنے ظرف کے مطابق سیرابی حاصل کرکے تشنگی کو دور کرتا، اور ''وادیِ ادب'' کے ''رہروانِ شوق'' اپنی منزلِ مقصود کا سراغ پالیتے۔حضرت والاؒ سب سے پہلے اشعار کی ترکیب بہ وضاحت بیان فرماتے۔اہلِ نظر پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ فنِ عروض کی پابندی اور وزن وقافیے کی پاس داری کے باعث اشعار میں جذبات واحساسات کو آزادی کے ساتھ مرتب الفاظ کا جامہ پہنانے کی گنجائش بہ نسبت نثر کے بہت کم ہوتی ہے؛ جس کی وجہ سے کلمات میں تقدم وتاخر، فعل وفاعل میں فصلِ غیر، باہم مربوط الفاظ میں دوری وغیرہ کا ہونا ایک امرِ لابدی ہے؛ بنابریں اشعار کی نحوی ترکیب ایک مشکل کام ہے اور اس ذمے داری سے کماحقہ عہدہ برآ ہونا ہر کس وناکس کا کام ومقام نہیں ہے؛ اسی وجہ سے حضرتؒ نہایت توجہ اور وضاحت کے ساتھ ترکیب بیان فرماتے، تاکہ طلبہ کو کلمات کا باہمی ربط وتعلق اور الفاظ کا ایک دوسرے سے جوڑ ذہن نشیں ہوجائے اور وہ ترجمہ وتشریح کے مرحلے میں حیران وسرگرداں نہ رہیں۔

اس کے بعد حلِ لغات کا نمبر آتا، اشعار میں مذکور مشکل کلمات کی لغوی صرفی وضاحت فرماتے،

اس حوالے سے بھی ان کے یہاں دو باتیں منفرد تھیں، ایک تو یہ کہ اگر عبارت میں مذکور عربی لفظ مختلف مفاہیم و متنوع معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا صرف وہی مفہوم ذکر فرماتے جو وہاں عبارت میں مقصود ہوتا، اور اس سلسلے میں اپنے استاذِ گرامی حضرت مولانا کیرانویؒ کے حوالے سے فرماتے تھے کہ اگر ایک لفظ کئی مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے تو دورانِ درس درپیش عبارت میں مقصود معنی ہی کو اچھی طرح ذہن نشیں کرانا مدرس کی ذمے داری ہے، ورنہ اگر تمام معانی کو ایک ہی جگہ بیان کر دیا جائے گا تو طالب علم کا ذہن ایک گونہ تشویش کا شکار ہوگا اور ان تمام مفاہیم کا حفظ وضبط بھی اس کے لیے دشوار ہوگا۔ دوسری چیز یہ کہ وہ مختلف معانی کے حامل لفظ کے معنی تو وہی ذکر فرماتے تھے جو پیشِ نظر عبارت میں مقصود ہوتے؛ لیکن اس ایک معنی کے لیے اردو میں بہ کثرت متبادل اور مترادفات ذکر فرماتے، جس کے نتیجے میں طلبہ کے ذہن و دماغ کے دریچے وا ہو جاتے اور وہ ''لکیر کے فقیر'' نہ رہتے؛ بلکہ از خود دورانِ ترجمہ صحیح متبادل لفظ کے انتخاب پر قادر ہو جاتے۔ مثلاً: **عذَل ـُ عذلاً**: ملامت کرنا، برا بھلا کہنا، زجر و توبیخ کرنا، ڈانٹ ڈپٹ کرنا، سخت سست کہنا، سرزنش کرنا، جھڑکنا، آڑے ہاتھوں لینا وغیرہ۔

بعد ازاں اشعار کا ترجمہ فرماتے اور اس سلسلے میں درسِ نظامی کی تدریس میں رائج ''روایتی انداز'' کی تقلید سے حد درجہ گریزاں رہتے۔ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ وہ صرف ترجمہ کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ترجمہ نگاری کا فن سکھاتے تھے۔ ''ترجمہ نگاری'' کو بہت سے اصحابِ نظر نے فنِ ''انشاپردازی'' سے زیادہ مشکل اور دشوار قرار دیا ہے؛ اس لیے کہ انشاپردازی کے دوران اظہارِ خیال کے لیے صاحبِ قلم نہ کسی غیر کے افکار و خیالات کا پابند رہتا ہے اور نہ کسی دوسرے کے الفاظ و تعبیرات یا اسلوبِ نگارش کا، جب کہ ایک تخلیق کو اصل زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے والے کے لیے جہاں ''مترجَم منہ'' اور ''مترجَم الیہ'' دونوں زبانوں میں مہارتِ تامہ اور کامل دست رس کا ہونا ضروری ہے، وہیں دورانِ ترجمہ اسے مصنف کی شخصیت اور اس کے فکر و اسلوب کا بھی پابند رہنا پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ اس پہلو پر بھی مکمل توجہ فرماتے، نہایت شگفتہ، شستہ، شائستہ اور ادبی زبان میں اشعار کا ترجمہ فرماتے، اس سلسلے میں اپنے تجربات بھی بیان فرماتے اور رائج اغلاط پر تنبیہ بھی فرماتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ''ترجمہ نگاری'' کے گُر بتاتے، فنی اصولوں سے روشناس کراتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دشت میں آبلہ پائی کے اصول و آداب سے شناسائی ہمیں اسی درس گاہِ علم و ادب میں پہنچ کر ہوئی۔ دورانِ درس ان کے بیان کردہ چند اصول قارئین کی نذر ہیں:

۱- ترجمہ نگاری کے دوران ''مترجَم منہ'' زبان کے بجائے ''مترجَم الیہ'' زبان کے محاورات اور اس کے تقاضوں کا پابند رہنا ضروری ہے، چناں چہ فرماتے: مثلاً: ''**ذهب زيد إلى المحطة**'' کا صحیح ترجمہ یہ ہے: ''زید اسٹیشن گیا''، لفظ ''إلى'' کا الگ سے کچھ ترجمہ کرنا، مثلاً: ''اسٹیشن تک'' یا ''اسٹیشن کی طرف'' یہ اردو محاورے کی خلاف ورزی ہے (البتہ کسی خاص مصلحت کے پیش نظر اس طرح کا ترجمہ کرنا بھی درست ہوگا؛ لیکن عمومی اصول یہی ہے)۔

۲- اردو زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ اس میں فعل ہمیشہ جملے کے اخیر میں مذکور ہوتا ہے، جب کہ فاعل و دیگر متعلقات پہلے ذکر کیے جاتے ہیں اور عربی میں جملہ فعلیہ کے اندر ہمیشہ فعل پہلے آتا ہے، بعد ازاں فاعل و دیگر متعلقات مذکور ہوتے ہیں؛ لہٰذا دورانِ ترجمہ یہ فرق ملحوظ رکھنا اور اس اصل کو مدنظر رکھنا ضروری ہے؛ چناں چہ مثال کے طور پر ''**انعقدت حفلة لتوزيع الجوائز في قاعة الحديث التحتانية في الثامنة ليلا**'' کا درست ترجمہ اس طرح ہوگا: ''رات آٹھ بجے دارالحدیث تحتانی میں ایک انعامی جلسہ منعقد ہوا''۔

۳- کسی بھی مضمون یا کتاب کا ترجمہ کرتے وقت یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی ضروری ہے کہ ترجمے میں ایسی شگفتگی، سلاست، روانی اور پختگی ہو کہ وہ پڑھنے والے کو ترجمہ نہ محسوس ہو؛ بلکہ اس کی حیثیت ''مترجَم الیہ'' زبان میں ایک مستقل مضمون یا کتاب کی ہو۔

''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر یہ چند مثالیں ذکر کی گئیں، نہ جانے کتنے ایسے آب دار نگینے اور جواہر پارے اس خزانۂ علم و ادب سے لٹائے جاتے تھے، جو اس راہ کے جویا کو نشانِ منزل کا پتہ دیتے ہیں۔

ترجمے کے بعد اشعار کی تشریح شروع ہوتی اور اس مرحلے پر آکر حضرت کا درس اوجِ کمال پر پہنچ جاتا، نہایت شرح و بسط کے ساتھ کلام فرماتے۔ متنبّی کے بارے میں ان کا یہ قول تھا کہ وہ کئی دماغوں کا ایک انسان اور اپنے زمانے کا سب سے بڑا شاعر ہے اور شاعر سے بڑھ کر دانش ور اور فلسفی بھی ہے، اس سلسلے میں خود متنبّی کا یہ قول بارہا ان کی زبانی سنا: ''**أنا و أبو تمّام حكيمان، و الشاعر البحتري**''۔ متنبّی کی شاعری سے گہری واقفیت رکھنے والے اہلِ نظر اس بات کی تصدیق فرمائیں گے کہ حیات و کائنات کے بے شمار فلسفوں اور کارگاہِ زیست کے حقائق و مسلمات کو جس خوش اسلوبی سے متنبّی نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے وہ بہت کم شعراء کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے، اس کی شاعری میں صرف تشبیہات و استعارات کا بانکپن ہی نہیں ہے؛ بلکہ خیال کی ندرت اور مضامین کی

بالیدگی بھی ہے،صرف الفاظ کے زیروبم اور تعبیرات کے پیچ وخم ہی نہیں ہیں؛ بلکہ نکتہ آفرینی اور معانی کی تہہ داری بھی ہے، اپنی بلند پروازِ تخیل کے ذریعہ وہ ایسے نظارے نگاہوں کے سامنے پیش کردیتا ہے جو دیدہ وروں کے خواب وخیال میں بھی نہیں آتے۔ حضرتؒ چوں کہ ایک رمز شناس و بابصیرت ادیب بھی تھے اور زمانے کے تلخ وشیریں سے آگاہ مفکر بھی؛اس لیے ان کے یہاں دیوانِ متنبّی پڑھنے اور سمجھنے کا الگ ہی لطف تھا، قدم قدم پر وہ متنبّی کی شاعری کی خصوصیات سے آگاہ کرتے، اشعار کی لڑی میں پروئے گئے حقائق وتجربات کو واضح کرتے اور شاعر کی نکتہ آفرینی اور عربی زبان پر اس کی مضبوط گرفت سے روشناس کراتے، ان کے میکدے سے بادہ خواری کا حظ اٹھانے والے اس بات کی تصدیق کریں گے کہ متنبّی کے بعض اشعار کی توضیح وتشریح کے حوالے سے ان کے ذاتی اجتہادات بھی تھے، جو زبان وادب کے حوالے سے ان کی وسعتِ نظر اور تعمقِ فکر کی روشن دلیل ہیں۔

حضرتؒ کے درس کی یہ ہلکی سی منظر کشی ہے، گو کہ بہت سے درسی امتیازات کا اس میں ضمناً تذکرہ آچکا ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ''سفینہ چاہیے اس بحرِ بےکراں کے لیے'' چناں چہ راقم آئندہ کی سطور میں ان کے اسباق کی چند مزید نمایاں خصوصیات مختلف عناوین کے تحت سپردِ قرطاس کررہا ہے، اگرچہ ''احاطہ'' اس کی بساط سے باہر ہے۔

طرزِ گفتگو

وہ تیرا رو بہ رو ہونا وہ ہم سے گفتگو کرنا
بہت پُر کیف لمحے تھے جو پھر آتے تو اچھا تھا

حضرتؒ کے درس کی ایک ممتاز خصوصیت آپ کا طرزِ تکلم اور اندازِ گفتگو تھا، جب سلسلۂ کلام شروع ہوتا تو تمام طلبہ گوش برآواز ہوجاتے، گفتگو میں ایسی سحر کاری، حلاوت اور چاشنی ہوتی تھی کہ ہر سننے والا ان کا گرویدہ ہوجاتا، ان کی تحریر کی جادوگری تو عالم آشکارا ہے؛ لیکن ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے ان کے تلامذہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ اپنی دل چسپ و دل نشیں گفتگو سے سامع کے دل کو موہ لینے کے ہنر سے بھی واقف تھے، آواز کا رنگ وآہنگ، الفاظ کا زیروبم، ادبی تعبیرات، اعضاء وجوارح کے معنی خیز ومنطبق اشارے، سب ہی وہ امور تھے جو ان کے کلام کے لطف کو دوبالا کردیتے تھے، ہر سننے والا بزبانِ حال یہ پکار اٹھتا:

ترا لہجہ، ترا جلوہ ترا اندازِ بیاں
تجھ میں خالق نے ہر اک چیز جدا رکھی ہے

حضرتؒ سے استفادے کا موقع ہمیں اس وقت میسر آیا جب ان کا کاروانِ حیات ساٹھ کی دہائی کو تجاوز کر چکا تھا، گونا گوں امراض اور مختلف عوارضِ صحت سے آپ نبرد آزما تھے؛ لیکن اس کے باوجود ان کے طرزِ تدریس، اندازِ کلام اور دورانِ درس ولولہ ولگن دیکھ کر کبھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ مسند پر جلوہ افروز یہ شخصیت کئی امراض وآلام سے دو چار ہے۔

زبان وادب سے متعلق ذاتی تجربات سے طلبہ کو آگاہ کرنا

بنیادی طور پر تو حضرتؒ عربی زبان کے عبقری معلم: حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے فیض یافتہ اور ان ہی کے مدرسۂ علم وادب کے ساختہ وپرداختہ تھے اور ان کے عطا کردہ نقوش وتجربات کو انھوں نے اپنے لیے راہِ عمل بنایا تھا؛ لیکن چوں کہ وہ بذاتِ خود راہِ علم وادب میں عرصہائے دراز سے آبلہ پا تھے اور قرطاس وقلم سے ان کی وابستگی نصف صدی کا قصہ ہے، کوئی دو چار برس کی بات نہیں، اس بنا پر ان کے پاس ذاتی طور پر تجربات ومشاہدات کا ایک وافر حصہ تھا، جو ان کی وسعتِ نظر، تعمقِ فکر، علمی کدوکاوش اور اس راہ میں جہدِ مسلسل اور سعیِ پیہم کی دین تھے؛ چناں چہ وہ نہایت اہمیت کے ساتھ طلبہ کے سامنے ان تجربات کو ذکر فرماتے، بارہا یہ جملہ بھی ارشاد فرماتے کہ: ''یہ میرے ذاتی تجربات ہیں جو کسی کتاب میں اس طرح لکھے ہوئے نہیں ملیں گے''۔

بہ طور خاص تعبیرات کے مواقعِ استعمال میں ان تجربات کو خوب ذکر فرماتے، اگر ایک ہی مفہوم کی ادائیگی کے لیے دو یا زائد مختلف تعبیریں مستعمل ہیں تو ان کے درمیان معنوی دقیق فرق اور ان کے محلِ استعمال کو واضح فرماتے، مثلاً: کسی چیز کو مقصد اور نشانہ بنانے کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے ''**هدف إلی كذا**'' بھی مستعمل ہے اور ''**استهدف كذا**'' بھی۔ حضرت نے یہ فرق سمجھایا کہ اصلاً تو دونوں مترادف ہیں؛ لیکن ایجابی اور مثبت مفاہیم کے لیے ''**هدف إلی كذا**'' کا استعمال ہوتا ہے، اور سلبی اور منفی معنی کے لیے ''**استهدف**'' کا۔

ان تجربات کی بعض مثالیں ''طرزِ تدریس'' کے عنوان کے تحت ترجمہ نگاری کے اصولوں کے ضمن میں گزر چکی ہیں۔

تعبیرات کی تفہیم

تکمیل ادب کی جماعت میں حضرتؒ سے ''**المختارات العربية**'' متعلق تھی، جس میں حل عبارت ولغات اور ترجمے کے بعد سب سے اہم امر عربی جملوں کی ساخت اور تعبیرات کو سمجھنا اور پھر ان پر مشق وتمرین ہے؛ چناں چہ حضرت دورانِ درس آنے والی نئی اور منتخب تعبیرات طلبہ کو سمجھاتے،

ان کے مواقعِ استعمال، صلات کی اہمیت، صلات کے فرق سے افعال کے ترجمے میں تغیر، مترادفات کے مفہوم میں دقیق فرق، وغیرہ جیسے عقدوں کی گرہ کشائی فرماتے۔ تعبیرات کا ترجمہ ہی ایسے انداز میں فرماتے کہ مکمل مفہوم مع صلے کے سمجھ میں آجاتا، مثلاً فرماتے: "**اعتمد أحد علی کذا**" فاعل کا مجرور بہ "**علی**" پر بھروسہ کرنا/ اعتماد کرنا، "**هنأ أحد غيرَه بكذا**" فاعل کا مفعول بہ کو "با" کے مجرور کی مبارک باد دینا، "**صرف أحد غيره عن كذا**" فاعل کا مفعول بہ کو مجرور بہ "**عن**" سے روکنا/ دور کرنا، اس کے بعد ان تعبیرات پر بذاتِ خود جملے بنا کر سمجھاتے اور طلبہ کو پرزور انداز میں تاکید فرماتے کہ اپنے کمروں میں جا کر ان تعبیرات کو اپنے جملوں میں استعمال کریں، جملوں کے اندر تمام ممکن تغیرات (فاعل کی تبدیلی، متعلقاتِ فعل اور صیغوں میں تغیر وغیرہ) عمل میں لائیں، نتیجتاً تعبیر مکمل مالہ وماعلیہ کے ساتھ ذہن میں راسخ ہوجائے گی۔

رائج اغلاط پر تنبیہ

عربی زبان وادب سے واقفیت وبصیرت رکھنے والے ہر فرد پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ فی زمانہ عربی زبان میں بہت سی ایسی تراکیب، تعبیرات والفاظ درآئے ہیں جو قواعد وضوابط کی میزان پر کھرے نہیں اترتے اور بابِ سخن میں وہ اغلاط ہی کے قبیل سے ہیں، اگر غور کیا جائے تو بنیادی طور پر اس کے تین اسباب سمجھ میں آتے ہیں:

پہلا سبب: عام گفتگو اور بول چال میں فصیح کے بجائے "علاقائی اور عامی زبان" کا استعمال۔ "عامی زبان" میں قواعد کی پابندی تو درکنار الفاظ اور صیغوں کا درست تلفظ بھی نہیں کیا جاتا اور اس وقت پورے عالمِ عرب میں عوام ہی نہیں، خواص کی بھی ایک بہت بڑی تعداد تکلم اور بول چال کی حد تک فصیح کے بجائے عامی زبان کا ہی دامن تھامے ہوئے ہے؛ اس لیے تحریر وانشا پردازی کے باب میں بھی عربی زبان اغلاط کی آلودگی سے پاک نہ رہ سکی؛ چنانچہ حضرتؒ دورانِ درس بھی اور اپنی تحریروں کے ضمن میں بھی جابہ جا تاکید فرماتے کہ تحریر ہو یا تقریر، بہرصورت فصیح زبان کی پابندی اور اس کے قواعد وضوابط کو بروئے کار لانا ہی عربی زبان سے سچی محبت کا تقاضا ہے۔ اس حوالے سے حضرتؒ کی حساسیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عالمِ عرب میں مقامی اور عامی زبان کے غلبے کو انھوں نے مذہب اسلام اور اس کے دو بنیادی مصدر قرآن وحدیث کے خلاف ایک دانستہ اور دوررس سازش کے طور پر ذکر فرمایا ہے، چنانچہ "**متی تکون الکتابات مؤثرة؟**" (ص ۴۶) پر رقم طراز ہیں: "**وكان ذلك مؤامرةً بعيدةَ المدى لمحاربة الإسلام عن طريق محاربة اللغة**

التي نزل بها و لمحاربة القرآن و الحديث..."۔

دوسرا سبب: اخبارات وجرائد میں مستعمل زبان میں قواعد وضوابط کی کما حقہ پاس داری کا نہ ہونا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دورِ ترقی میں اخبارات کی کثرت، جرائد وصحف کی بے پناہ اشاعت نے عربی زبان کو ایک نئی وسعت وہمہ گیری سے ہم کنار کرایا ہے؛ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان میں (بہ طور خاص اخبارات میں) استعمال ہونے والی زبان میں قواعدِ عربیت کی کما حقہ پاس داری وپابندی نہیں کی جاتی، نتیجتاً اس گوشے سے بھی بہت سی اغلاط عربی زبان میں راہ پاگئیں، اور زبان زدِ خاص وعام ہوگئیں، حضرتؒ کے دروس ونگارشات سے استفادے کی بنیاد پر راقم اس نتیجے پر پہنچا کہ اخبارات کی زبان کے واسطے سے درآنے والی اغلاط بالعموم تین طرح کی ہوتی ہیں:

(۱) نحوی قواعد کی خلاف ورزی۔ مثلاً اگر مضاف الیہ ایک ہو اور مضاف متعدد تو صحیح تعبیر اس طرح ہوگی کہ اولاً مضافِ اول کو ذکر کریں گے، پھر مضاف الیہ، اس کے بعد مضافِ ثانی کو مضاف الیہ سابق کی ضمیر کے ساتھ لایا جائے گا، مثلاً اگر ہمیں یہ کہنا ہے: ''مسجد حرام کے امام وخطیب'' تو صحیح تعبیر یوں ہوگی: "**إمام المسجد الحرام و خطيبه**"'' عربی زبان کی نشأت اور اس کا ارتقاء'' "**نشأة اللغة العربية و تطورها**"؛ لیکن اخبارات وجرائد میں بہ کثرت اس کے خلاف (**إمام و خطيب المسجد الحرام، نشأة و تطور اللغة العربية**) رائج ہے۔ اسی طرح لفظ "**كافّة**" کا درست استعمال یہ ہے کہ ترکیب میں اسے ماقبل سے حال بنایا جاتا ہے، ارشاد باری ہے: ﴿**ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً**﴾ جب کہ اب اس کا استعمال خود ذو الحال کی طرف اضافت کے ساتھ ہونے لگا۔ **كافّة الناس، كافّة المشاكل** وغیرہ۔

(۲) صلات کے استعمال میں غلطی۔ **عانى معاناةً** کے ساتھ "**من**" (**يعاني فلان من شدة المرض**) کا استعمال، **استأذن** کے ساتھ "**من**" (**استأذن فلان من أبيه للسفر**) کا استعمال، اور **أجاب إجابةً** کے ساتھ "**على**" (**أجاب على سؤاله**) کا استعمال۔ یہ سب صلات کی رائج اغلاط ہیں۔

(۳) اصل عربی الفاظ کے ہوتے ہوئے انگریزی سے معرّب الفاظ کا استعمال، مثلاً: "**المجمع**" کے بجائے "**أكاديمية**"، "**الحاسوب**" کے بجائے "**الكمبيوتر**"، "**الحافلة**" کے بجائے "**الباص**" اور "**سيارة الأجرة**" کے بجائے "**تاكسي**" وغیرہ کا استعمال یہ ان ہی اخبارات وجرائد کی دین ہے۔

ممکن ہے بہت سے اہل نظر کو مذکورہ بالا بعض امور کو از قبیلِ اغلاط گرداننے سے اختلاف ہو؛

لیکن بہر حال یہ امور قواعد وضوابط کی کسوٹی پر کھرے نہیں اترتے، یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ ’’کا ذوقِ سلیم‘‘ ان کو درست ماننے سے ہمیشہ اِبا ر کرتا تھا۔

تیسرا سبب: اردو زبان میں بہ کثرت عربی الفاظ کا استعمال۔اس تیسرے سبب کا تعلق برِصغیر ہند و پاک کے اردوداں طبقے سے ہے اور وہ یہ کہ اردو زبان میں بے شمار الفاظ وہ مستعمل ہیں جو اپنی اصل ساخت کے اعتبار سے عربی ہیں؛ لیکن قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ بالعموم اردو میں وہ الفاظ الگ معنی میں مستعمل ہیں، جب کہ عربی میں ان کے متبادل کلمات الگ ہیں، برِصغیر کا اردوداں طبقہ جب عربی سے وابستگی کے بعد اس میں خامہ فرسائی کرتا ہے تو بسا اوقات ناواقفیت کی وجہ سے یا معاجمِ لغویہ کی بہ کثرت مراجعت کی عادت نہ ہونے کی بنا پر اس کے قلم پر اس طرح کے الفاظ اسی معنی میں جاری ہوتے ہیں جس میں وہ اردو میں مستعمل ہیں، حالاں کہ ان کا صحیح متبادل عربی زبان میں الگ ہے، مثلاً ’’صدر‘‘ عربی لفظ ہے؛ لیکن اردو میں جس معنی میں یہ استعمال ہوتا ہے اس کا صحیح عربی متبادل ’’**الرئیس**‘‘ ہے، اسی طرح ’’وکیل‘‘ کے لیے ’’**المحامي**‘‘، ’’ملازم‘‘ کے لیے ’’**الموظّف**‘‘، ’’ملازمت‘‘ کے لیے ’’ **الوظیفة**‘‘، ’’ملاقات‘‘ کے لیے ’’**اللقاء، المقابلة**‘‘، ’’ملک‘‘ کے لیے ’’**الدولة**‘‘ وغیرہ صحیح عربی متبادل ہیں؛ حالاں کہ ان میں سے ہر ایک لفظ عربی میں بھی دوسرے مفاہیم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

حضرتؒ قدم قدم پر طلبہ کو اس طرح کی اغلاط سے آگاہ فرماتے، وہ ہمیشہ اس بات کی طرف متوجہ فرماتے تھے کہ کسی بھی تحریر کا اصل کمال، اس کا دل کش ادبی تعبیرات، خوب صورت استعارات و کنایات وغیرہ پر مشتمل ہونا نہیں؛ بلکہ اصل کمال تو اس کا قواعدِ عربیہ کے مکمل مطابق ہونا اور رائج اغلاط سے پاک ہونا ہے۔

رموزِ اوقاف کی پابندی اور املا و تحریر کی درستگی کی تلقین

جس طرح الفاظ کا درست انتخاب، فکر و خیال کی بلندی اور معانی کی تہہ داری کسی بھی تحریر کے بنیادی اجزا ر کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح املا کی درستگی بھی تحریر کے کلیدی عناصر میں شامل ہے؛ اس لیے کہ اگر مضمون میں صحیح املا کی رعایت نہ کی جائے تو بسا اوقات الفاظ ہی بدل جاتے ہیں، اور قاری کے لیے (بہ طور خاص جو قواعد و رموزِ املا کا عادی ہو) صاحبِ تحریر کی مراد سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، نیز ’’ذوقِ سلیم‘‘ پر گرانی کا باعث بھی ہوتا ہے۔اسی طرح اگر تحریر میں رموزِ اوقاف (سکتہ، وقفہ، ختمہ، رابطہ، فجائیہ وغیرہ) کی رعایت بھی ہو تو اس کا پڑھنا اور سمجھنا نہایت سہل ہو جاتا ہے؛ اس لیے کہ ان

علامات اور رموز سے معلوم ہوتا ہے کہ دو جملوں کے درمیان کس طرح کا ربط ہے، کون سا جملہ برسبیلِ تعجب ہے اور کون سا ازقبیلِ سوال، کہاں سے نئے عنصر کا آغاز ہو رہا ہے اور کس جملے پر اختتام ہو رہا ہے وغیرہ۔

حضرتؒ کے درس کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک ان کا طلبہ کو املا کی درستگی اور رموزِ اوقاف کی اہمیت سے روشناس کرانا ہے، حقیقت یہ ہے کہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد دورۂ حدیث شریف تک پہنچنے کے بعد بھی ان امور سے کما حقہ واقف نہیں ہوتی؛ لیکن جب وہی طلبہ تکمیلِ ادب کی جماعت سے وابستہ ہوتے اور حضرتؒ کے درس سے مستفید ہونے کا موقع انھیں نصیب ہوتا تو ان امور کے تعلق سے ان کی ''ناواقفیت'' اور ''وحشت'' ختم ہو کر ''انسیت'' میں بدل جاتی۔ گاہے گاہے طلبہ کو اپنی مشہورِ زمانہ کتاب ''حرفِ شیریں'' کو پڑھنے اور اس میں بیان کردہ امور کی عملی تطبیق کی نصیحت فرماتے۔

اسی طرح طلبہ کو تحریر کی درستگی اور خوش خطی پر توجہ دلاتے۔ خود ان کا خط بھی نہایت پاکیزہ، نفیس اور خوبصورت تھا، راقم حروف نے ''النادی الادبی'' کے محفوظات میں حضرت کے دستِ مبارک سے خطِ نسخ میں لکھے ہوئے ان کے زمانۂ طالب علمی کے ایک ''مجلّے'' کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہے، تحریر کی جاذبیت اور خط کی دل کشی ایسی ہے کہ کوئی صاحبِ ذوق لطف اٹھائے بغیر نہ رہ سکے؛ بلکہ بظاہر دیکھنے والا فرق نہیں کرسکتا کہ یہ ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے یا کمپیوٹر سے ٹائپ شدہ۔ ان کا خطِ نسخ ماضی میں استعمال ہونے والے ''مصری ٹائپ رائٹر'' سے بہت حد تک مشابہ تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ: ''حسنِ خط طالب علم کا زیور ہے''۔ حسنِ خط کے فوائد و منافع اور بدخطی کے مضرات و نقصانات سے متعلق حضرتؒ نے جو ''حرفِ شیریں'' میں گفتگو فرمائی ہے وہ ہر طالب علم کے لیے مطالعے کی چیز ہے؛ بلکہ وہ مکمل کتاب ہی اپنے قیمتی مشمولات کی بنا پر رہروانِ علم و ادب کے لیے ''متاعِ بیش بہا'' اور ''گنجِ گراں مایہ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرتؒ کے اسباق کی یہ چند خصوصیات و امتیازات اور ان کے دروس و نگارشات سے حاصل ہونے والے کچھ تجربات ہیں جو طالبانِ علومِ نبوت کے لیے راہ نما ہدایات اور ایسے روشن نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کو اپنے ''علمی سفر'' میں ''زادِ راہ'' بنالینا ان کے لیے تابناک مستقبل کا ضامن ہے۔ حضرتؒ کے درس سے متعلق اپنی اس دراز نفس گفتگو کو راقم ان اشعار کے ساتھ ختم کرتا ہے:

تشنہ کاموں کے لیے یوں فیض ان کا عام ہے   جیسے ہو وسطِ بیاباں میں کوئی پانی کی جھیل

دل میں یوں پیوست ہوجاتی تھی تعلیم آپ کی جیسے خاتم میں نگینہ، تختۂ کشتی میں کیل
عمر بھر اس سے ہدایت لیں گے تلمیذ آپ کے آپ کے اسباق ہیں علمی سفر میں سنگِ میل

لغتِ حجاز کے رمز شناس صاحبِ قلم

عربی زبان وادب سے پروانہ وار قلبی وابستگی، اپنی نوکِ قلم سے اس کی زلفوں کو سنوارنا اور اس کے سرمائے میں قیمتی اور گراں قدر جواہر پاروں کا اضافہ کرنا، حضرتؒ کی داستانِ حیات کا سب سے درخشاں ورق اور ان کے علمی کارناموں کی اصل جولان گاہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان وادب کی حیثیت آپؒ کے لیے محض ایک علم اور فن ہی کی نہیں تھی؛ بلکہ یہ ان کا ذوق اور حال بن گیا تھا اور ان کے جسم وجان اور رگ و ریشے میں اس طرح رچ بس گیا تھا جیسے پھولوں میں خوشبو اور ستاروں میں روشنی

ع شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

انھوں نے تقریباً نصف صدی تک پرورشِ لوح وقلم کا فریضہ انجام دیا، لگ بھگ پانچ دہائیوں تک ان کے قلم کا ستارۂ بلند اقبال برِصغیر کے افق پر جگمگاتا رہا، اس طویل عرصے کے دوران انھوں نے اپنے قلم کے ذریعہ وہ نمایاں خدمات انجام دیں جو ''جریدۂ عالم'' پر ان کے ''نقوشِ دوام'' ثبت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مجلّہ ''الداعی'' کا ترقی ومقبولیت کے مدارج طے کرتے ہوئے شہرت کے بامِ عروج تک پہنچنا ان ہی کی شبانہ روز محنتوں کا رہینِ منت ہے، کم وبیش چالیس سال تک انھوں نے ''الداعی'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے اور اس شان سے کہ صرف برِصغیر ہی نہیں؛ بلکہ عالمِ عرب تک دارالعلوم دیوبند کی ''صدائے حق'' کا فیض پہنچایا اور ''نغمۂ ہندی'' کو ''حجازی لے'' میں پیش کرنے کی ذمے داری کو بہ خوبی نبھایا۔

ان کی ایک اور ممتاز خصوصیت جو علم وادب کے رہ نوردوں کے لیے ''شاہِ کلید'' کی حیثیت رکھتی ہے، یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کو محض ''لالہ وگل'' کے ''افسانوں'' یا ''حسیں خوابوں'' کی نقاشی کے لیے کبھی نہیں استعمال کیا؛ بلکہ اسے خدا کی عطا کردہ امانت سمجھ کر ہمیشہ دعوت الی اللہ اور پیغامِ حق کی ترجمانی کے مقدس فریضے کی انجام دہی کا ذریعہ بنایا؛ یہی وجہ ہے کہ ان تحریروں میں داعیانہ بصیرت بھی ہے اور مفکرانہ دیدہ وری بھی، دردمندانہ شعور بھی ہے اور ایمان افروز تجزیہ بھی، ایک مومن ادیب کی روشن ضمیری بھی ہے اور ایک سچے داعی الی اللہ کا سوز بھی۔

وہ چوں کہ عربی زبان کے رمز شناس، کوائفِ تازہ اور احوالِ واقعی سے باخبر، بصیرت مند اور

دیدہ ور ادیب تھے؛ اس لیے وہ اپنوں کی ''سادگی'' اور غیروں کی ''عیاری'' سے بہ خوبی آگاہ تھے اور ان عیاریوں کو اجاگر کرنے اور امتِ مسلمہ کو درپیش مسائل وخطرات سے باخبر کرنے کے تعلق سے اپنی ذمے داری کا انھیں مکمل احساس تھا، ان کے قلمِ حقیقت رقم سے وجود میں آنے والے بہت سے ''شاہ کار''، بہ طور خاص: ''فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں''، ''کیا اسلام پسپا ہورہا ہے؟'' اور ''موجودہ صلیبی صہیونی جنگ'' ان کے اسی احساس وشعور کا نتیجہ ہیں۔

وہ عربی میں ایک منفرد اور نرالے اسلوب کے مالک تھے، جس میں حلاوت بھی تھی اور لطافت بھی، قوت بھی تھی اور تاثیر بھی، خیالات کا بانکپن بھی تھا اور پیرایۂ بیان کا تنوع بھی، ان کی نثر نسبتًا طویل جملوں؛ لیکن عمدہ، پرشکوہ اور دل کش تعبیرات پر مشتمل ہوتی تھی، غرضے کہ ایک باذوق قاری کی تسکین وتسلی کا مکمل سامان ان کی تحریر میں تھا۔ نمونے کے طور پر درجِ ذیل اقتباس نذرِ قارئین ہے جو ''تحریر وبیان میں قوت وتاثیر کے حصول کے اسباب'' کے عنوان سے متعلق ہے:

"الكتابات تكتسب الجمالَ، و القوة، والتأثير بالعواطف التي تتفجَّر من أعماق القلب، و مَشاعر التألّم التي تُكيِّف كلًّا من القول والفعل بمعانٍ لايقدر على التعبير عنها لسان أي "سحبان" وقلم أي "جاحظ".

إن مجرَّد ترتيب الحروف لتتكوّن كلمات، و تصفيف الكلمات لتصير جُمَلاً وفقرات، وإسناد الجمل إلى الجمل لتُصبح نصًّا متكاملاً، ليس بشيء إذا تجرَّد من المعاني المذكورة أعلاه؛ لأن النص الخالي منها جسَد بلا روح، لا يمشي و لا يتحرك، ولا يؤدّي دورَه في الحياة.

إن الكتابات أصلاً هي كتابات من يعتقد أنَّ الكتابة في الواقع مسؤوليةٌ أمامَ اللّٰه و خَلْقه، كُلِّف هو أداءَ ها عند ما أُهِّل لها بتقدير العزيز العليم.

ومن يعتقد هذا الاعتقاد يكتب ما يكتب بدم القلب لا بالمِداد، وعن وحيٍ من الضمير، و إملاءٍ من الغيرة، وإلهامٍ من التوفيق الإلهي، والإنسانية التي يتصف بها و يصدر عنها في جميع أعماله في الحياة". (متى تكون الكتابات مؤثرةً؟)

عربی میں ان کی تالیفات تقریبا ایک درجن ہیں، جن میں **"فلسطين في انتظار صلاح الدين"، "مفتاح العربية"، "الصحابة و مكانتهم في الإسلام"، "تعلموا العربية فإنها**

من دينكم"، "متى تكون الكتابات مؤثرة؟"، "من وحي الخاطر"، "مجتمعاتنا المعاصرة و الطريق إلى الإسلام"، "العالم الهندي الفريد الشيخ المقرئ محمد طیبؒ"وغیرہ شامل ہیں۔

''الداعی'' کی کامیاب اور بے مثال ادارت اور مذکورہ گراں قدر تالیفات کے علاوہ ان کا ایک عظیم کارنامہ اکابر کی کتابوں کو اردو کے قالب سے عربی سانچے میں ڈھالنا ہے؛ چناں چہ انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی میاں ندویؒ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ وغیرہ اکابر کی تقریباً ۳۵ کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور ان اکابر کے ''تام'' فیض کو مزید ''عام'' کردیا۔

گلستانِ اردو کے گل سرسبد

حضرتؒ کے قلم کی جولانیاں صرف عربی زبان تک محدود نہ تھی؛ بلکہ وہ اردو زبان کے بھی بلند پایہ اور ممتاز صاحبِ قلم تھے؛ چناں چہ ان کے خامۂ گہر بار نے دامنِ اردو کو بھی بے شمار آب دار موتیوں سے مزین کیا۔ یوں تو ان کے ذہنِ رسا نے اشہبِ قلم کو مختلف ومتنوع موضوعات کی سیر کرائی ہے؛ لیکن سوا□ باب اور شخصیات پر تحریر کردہ مضامین ومقالات میں ان کے قلم کی جولانیاں اور رعنائیاں عروج پر ہوتی ہیں۔ ان کی تالیف کردہ مشہور زمانہ کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' ایک لائق وفائق سعادت مند شاگرد کی جانب سے اپنے محبوب عبقری استاذ کی شان میں صرف ایک خراجِ عقیدت کی حیثیت ہی نہیں رکھتی؛ بلکہ وہ زبان وقلم کے تعلق سے ان کی عظمتوں کا روشن حوالہ بھی ہے۔ اس کتاب کی سطر سطر سے جہاں ان کی اپنے استاذ کے تئیں محبت وعقیدت سے سرشاری جھلکتی ہے، وہیں مؤلف کی زبان وبیان پر قدرت، اس کی نزاکتوں اور خوب وزشت سے گہری واقفیت بھی صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ نے اس کتاب کی تالیف کے ذریعہ سوا□ باب میں ایک نیا ''طرزِ جنوں'' متعارف کرایا ہے، جس میں مضامین ومعانی کی ترتیب میں بھی ''روایتی طرز'' کی ''تقلید'' سے ہٹ کر الگ روش اختیار کی ہے اور الفاظ وتعبیرات میں بھی ''مانگے کے اجالے'' سے بالکلیہ پرہیز کیا ہے۔ بہ طورِ نمونہ ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو ان کی خوبصورت انشاپردازی کا نمونہ بھی ہے اور چاشنی بھری نثر کا نقشِ دوام بھی:

''اب کسی کو کس طرح بتاؤں کہ نو جوانانِ مسلم اور عشاقانِ زبانِ محمدی وتہذیبِ حجازی کے لیے

مولانا کیا تھے اور کیا نہ تھے:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

خوابیدہ صلاحیتوں کے لیے مرغِ سحر، افسردہ دلوں کے لیے مرغِ چمن، مردہ ضمیروں کے لیے حرارتِ نفس ہائے مسیح، کسل مندوں کے لیے بانگِ درا، ناشکیبوں کے لیے ضربِ کلیم، شرمندگانِ ساحل کے لیے بحرِ بےکراں، مغلوبانِ گماں کے لیے یقینِ محکم، اوراسیرانِ آرزو کے لیے عملِ پیہم۔ جب بھی جی نہ لگتا، تو مولاناؒ کے پاس جاتا اور تخمِ عمل اورنخلِ فکرونظر کے لیے ہمیشہ سازگار آب وہوا کی ایک بڑی قسط لے کر واپس آتا۔ نا امید جاتا اور دل کے لالۂ افسردہ کو آتش قبا کر کے واپس آتا۔ کوئی خوشی ہو یا غم، ان سے ضرور ملتا؛ کیوں کہ وہ خوشی کو دو بالا اور غم کے لیے زوداثر مرہم، ہم دست کردیتے''۔ (وہ کوہ کن کی بات: ص۶۱-۶۲)

حضرتؒ کے قلم کا ایک اور وقیع شاہ کار مشہورِ زمانہ شخصیات پر ان کے تحریر کردہ مضامین کا مجموعہ ''پسِ مرگ زندہ'' ہے، یہ کتاب بھی سرمایۂ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، تمام ہی مضامین میں ان کی زبان نئی تراکیب اور خوش نما ادبی تعبیرات سے بھرپور ہے، خیال کی ندرت، اسلوبِ نگارش کی حلاوت، طرزِ بیان کی سحر کاری اور ظرافت وبذلہ □ وغیرہ یہ وہ امور ہیں جن کی بنیاد پر قاری کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کے الفاظ میں شوکت وجلال اور رعنائی و جمال کا بہت خوبصورت وصال نظر آتا ہے، ان کی تحریر صرف جادو نہیں جگاتی؛ بلکہ ذہن کے بند دریچوں کو بھی وا کرتی ہے۔ ''پسِ مرگ زندہ'' کا بھی ایک اقتباس نذرِ قارئین ہے:

''مولانا (منظور) نعمانیؒ نے دارالعلوم دیوبند میں ایسے علمائے نام دار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، جو عالم میں انتخاب اور علم وعمل کے آفتاب و ماہ تاب تھے، علم وعمل کی جامعیت کے اعتبار سے اِس وقت ان کی نظیر نہ صرف برصغیر میں؛ بلکہ پوری دنیا میں نہیں مل سکتی۔ آج علم کی ''سرکشی'' اور معلومات کی ''دھماکہ خیزی'' و ''رستاخیزی'' کا دور ہے۔ عقل نے قلب کے خلاف اور علم نے عشق کے خلاف ''مسلح'' کام یاب اور افسوس ناک ''بغاوت'' کر رکھی ہے۔ ''زبانِ ہوش مند'' ''دلِ روشن'' پر غلبہ پایا چاہتی ہے اور مادّیت اپنے تمام کرّ و فر کے ساتھ روحانیت سے برسرِ پیکار ہے۔ سب سے زیادہ خطرے کی بات یہ ہے کہ بہت سی جگہ اور بہت سی مرتبہ اول الذکر، ثانی الذکر پر اُسی کی شکل وصورت میں حملہ آور ہوتی رہتی ہے؛ اس طرح ''من کی دنیا'' کے مخلصوں اور ''تن کی دنیا'' کے اہل کاروں میں بہت سے

ظاہر بینوں کے لیے فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے''۔(پسِ مرگ زندہ:ص ۳۹۷)

اردو میں حضرت کی کتب کی تعداد آٹھ ہے، جس میں مذکورہ دو کتابوں (وہ کوہ کن کی بات اور پس مرگ زندہ) کے علاوہ ''فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں''، ''کیا اسلام پسپا ہورہا ہے؟''، ''موجودہ صلیبی صہیونی جنگ''، ''حرفِ شیریں''، ''خط رقعہ کیوں اور کیسے سیکھیں؟'' اور ''رفتگانِ نارفتہ'' شامل ہیں۔

آج استاذ محترمؒ ہمارے درمیان نہیں ہیں؛ لیکن ''جہدِ مسلسل'' اور ''عملِ پیہم'' سے عبارت ان کی حیاتِ بابرکات کے یہ روشن نقوش ان کے تلامذہ اور محبین و مخلصین کو صبر و ہمت، جفاکشی، بلند حوصلگی اور اَن تھک محنت وجد و جہد کے ساتھ کامیاب و بامقصد زندگی گزارنے کے لیے ہمیشہ مہمیز کرتے رہیں گے۔ گوکہ ان کی رحلت سے بزمِ قرطاس وقلم برہم ہوگئی اور جہانِ ادب تاریک ہوگیا؛ لیکن اپنی تحریرات وتالیفات میں بکھرے ''جواہر پاروں'' کی بنیاد پر وہ قدر دانوں کے دلوں میں پسِ مرگ زندہ رہیں گے۔

کلیوں کو میں سینے کا لہو دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضا یاد کرے گی

اور

تیرے اعمال ابد تک نہ مریں گے ہرگز
رہ نما ہے ترا نقشِ کفِ پا تیرے بعد

❁ ❁ ❁

خورشید ادب کا دو جہتی نور مولانا نور عالم خلیل امینی

از: ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی
آر، ایل، ایس، وائی کالج، بتیا، مغربی چمپارن

ہر زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد رہی ہے؛ لیکن اس ہجوم میں انفرادی حیثیت اور امتیازی مقام ایک آدھ کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ ایسا نصیبہ ور روز اول سے ہی اپنی سعی پیہم، جہد مسلسل اور عزم و حوصلے کے پیٹرول سے اپنے طویل اور عظیم سفر کو جاری رکھتا ہے، قدم آگے بڑھاتا رہتا ہے، دوران سفر ٹھوکریں کھاتا ہے، گر پڑتا ہے، گر کر اٹھتا ہے پھر اٹھ کر چلنے لگتا ہے۔ منزل تک رسائی کا جذبہ خالص اس کے دل میں اس طرح موجزن رہتا ہے کہ نہ تو اسے سفر کی تکان کا احساس ہوتا ہے، نہ ٹھوکریں اس کے قدم روک سکتی ہیں اور نہ ہی راہ کے گرد وغبار اسے راہِ منزل سے بدکا سکتے ہیں۔ بالآخر علم و ہنر کا یہ مسافر اپنے جسم و بدن کو نحیف و لاغر بنانے کے باوجود منزلِ مقصود پر کامیابی و کامرانی کا جھنڈا لہراتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اسی طرح کے عظیم لوگوں میں ایک نمایاں نام ادیب العصر مولانا نور عالم خلیل امینی کا ہے، جن کو بجا طور پر اپنے استاذ، اسم بامسمّٰی مولانا وحید الزماں کیرانویؒ (پ: ۱۹۳۰- ر: ۱۹۹۵ء) کا حقیقی وارث اور ان کی علمی، ادبی، فکری، تربیتی زندگی اور پہلو دار شخصیت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔

مولانا امینی نے ۱۹۵۲ء میں ہندوستان کی مردم ساز ریاست بہار کے ضلع مظفر پور میں آنکھیں کھولیں۔ اپنے وطن پھر اعظم گڑھ میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کر کے ۱۹۶۵ء میں دارالعلوم دیوبند آئے، کئی سال یہاں مقیم رہے۔ اس دوران انھوں نے روزگار زمانہ اساتذہ کی تربیت میں رہ کر اپنے علمی سفر کو جاری رکھا۔ مولانا کیرانویؒ کی ان پر خاص نظر رہی۔ شاگرد نے اپنے ذوق وشوق اور محنت ولگن کا مظاہرہ کیا اور اساتذہ کی طرف سے شفقت وعنایت کا سایہ رہا۔

تشنہ کام جب اپنی پیاس بجھانے کی خاطر دربدر کی خاک چھان کر کنویں کے پاس پہنچے تو کیا

کنویں کے لیے تشنہ لب کو سیراب کرنے میں بخل سے کام لینے کی گنجائش رہ سکتی ہے؟ قابل رشک ہیں وہ بچے جن کے بچپن کا بہترین دوست ذوق وشوق ہوتا ہے۔ایسا ہی کچھ حال مولانا امینی کا تھا۔بچپن ہی سے لکھنے، پڑھنے اور کچھ بننے کا جوش وجذبہ ان کے حصے میں آیا تھا؛ چنانچہ اپنے ظرف کے بقدر علم وادب کے موتیوں سے اپنے دامن کو بھرتے رہے؛ بلکہ عربی ادب کے مذاق کی کونپل بھی ابتدائی دور ہی سے پھوٹنا شروع ہوگئی تھی۔

۱۹۶۵ء میں مولانا امینی نے دیوبند آکر درجہ چہارم عربی میں داخلہ لیا۔اگرچہ اس وقت اسباق کی درجہ بندی کا نظام نہیں تھا۔مولانا کیرانوی سے باضابطہ تلمذ کا سلسلہ علامہ حریری کی شہرہ آفاق کتاب مقامات کے توسط سے ہوتا ہے۔ مئے کدہ قاسمی میں اسی صہبائے حریری کے ادبی جام کو ساقی وحید کے ذریعے تشنہ لب کو وہ سارا کچھ پلا دیا جاتا ہے جس کی مٹھاس، آسودگی اور لذت آج بھی باقی ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گی۔

اسی گل وبو کے تعلق کا اثر تھا کہ ۱۹۶۹ء میں مولانا امینی کے استاذ محترم کی نگاہ سے رسماً اوجھل ہوجانے کے باوجود حقیقتاً کبھی دوری نہیں ہوئی۔مدرسہ امینیہ دہلی میں داخلہ لیا اور مولانا سید محمد میاں مرحوم کی خدمت میں ایک ڈیڑھ سال رہ کر اپنے علم وقلم میں مزید نکھار پیدا کیا۔پھر یہیں سے ۱۹۷۱ء میں فضیلت کی سند حاصل کی۔کچھ دنوں بعد اپنی قابل رشک استعداد اور قابلیت کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں استاذ مقرر ہوئے اور وہاں سات آٹھ سال تک تدریسی ادبی اور صحافتی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۸۳ء میں اپنے معنوی باپ مولانا کیرانویؒ کے حکم سے دارالعلوم دیوبند آگئے۔مولانا امینی کا یہاں بحیثیت مدیر ماہنامہ الداعی عربی اور استاذِ ادبِ عربی تقرر ہوا۔اس وقت سے آج تک اپنے استاذ حضرت کیرانویؒ کی حقیقی جانشینی فرما رہے تھے اور ان کی ہر حرکت وسکون میں مولانا کیرانوی کی شفاف تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔مولانا امینی کے اندر بھی وہی حوصلہ اور وہی چاق چوبندی نظر آتی ہے۔انداز واسلوب، فکر ونظر اور طلبا کے مستقبل کی فکرمندی کے جذبے میں بھی استاذ کیرانویؒ کے سچے ترجمان ہیں اور شخصیت سازی ومردم سازی میں بھی ان کا مکمل نمونہ۔اس وقت بھی استاذ کیرانویؒ کی ڈگر پر چلتے ہوئے ان کی تحریک کو آگے بڑھانے میں دن ورات وہ ہمہ تن مصروف ہیں۔جس طرح مولانا موصوف نے اپنے استاذ محترم کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں اپنے جسم کو لاغر اور ہڈیوں کو پگھلا دیا اسی طرح وہ خود بھی اپنے شاگردوں کے روشن مستقبل کے لیے حسین خواب دیکھتے رہتے ہیں اور شاگردوں سے انھیں شرمندۂ تعبیر کرنے کی دلی خواہش کا اظہار بھی

کرتے رہتے ہیں۔

مولانا امینی جہاں ایک طرف ممتاز عالم دین اور معروف اسلامی اسکالر ہیں تو وہیں دوسری طرف ایک منجھے ہوئے مدرس اور مقبول قلم کار بھی۔ان کے نزدیک اصول کی پابندی اور وقت کی بڑی اہمیت ہے۔اپنے ہجوم اعذار کے باوجود ہجوم کار کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ شاید کسی معمول میں معمولی فرق آتا ہو۔ظاہر و باطن کی یکسانیت بھی انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے،اسی طرح موجودہ دور کی بداخلاقیوں اور ناہمواریوں سے بھی وہ بڑے نالاں رہتے ہیں۔

اپنی بے پناہ علمی مصروفیات کے باوجود گردوپیش کے احوال سے پوری طرح باخبر رہتے ہیں اور عالم اسلام کے مسائل سے بھی انھیں بڑی دل چسپی ہے بطورِ خاص فلسطین کے مسائل اور ان کا حل ان کا خاص موضوع ہے۔دیگر مشغولیات کے ساتھ وقفے وقفے سے وہ اپنی وقیع تصانیف کے ذریعے علمی،فکری وادبی تحریروں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔چوں کہ مولانا کا ادب سے گہرا رشتہ اور فن ادب میں مکمل دسترس حاصل ہے اس لیے ان کے قلم کا آبشار ادب کی مختلف وادیوں میں بہتا ہوا نظر آتا ہے۔تاریخ ہو یا سیر وسوانح،لسانیات کے حوالے سے لفظیات وساختیات اور اردو املا کی نوک پلک کی درستگی کا مسئلہ ہو یا خط کے ظاہری حسن وجمال کا معاملہ،ہر ڈگر پر مولانا امینی کا اشہبِ قلم دوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اگر حروف سے لفظ،لفظوں سے جملہ اور جملوں سے مضمون لکھنے کا ہنر جاننا ہو تو مولانا امینی کی حرف شیریں کی شیرینی سے لطف اٹھایئے اور اگر حسن خط کے حوالے سے ان کے فن کی تجلیوں کا مشاہدہ کرنا ہو تو اس کے لیے خط رقعہ ایک انمول تحفہ ہے۔مولانا امینی نے وہ کوہ کن کی بات! جیسی البیلی کتاب لکھ کر جہاں اردو کے سوا ادب میں اپنی ایک شناخت قائم کی وہیں یہ کتاب ایک ہونہار،وفا شعار شاگرد کی جانب سے ایک عظیم استاذ کی شان میں عمدہ خراج بھی ہے۔انھوں نے بچوں کی نفسیات کے پیش نظر عربی ادب میں بچوں کی دل چسپی بڑھانے کے لیے دو حصوں میں مفتاح العربیہ لکھ کر گویا نئے ذہنوں کے لیے عربی زبان کا دروازہ کھول دیا،جس سے تعلیم میں ان کی مہارت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ایسے ہی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان اقدس میں صحابہ کرامؓ اسلام کی نظر میں تحریر فرما کر جہاں بہت سی الجھنوں کو ختم کرکے کئی ایک عقدوں کو حل کیا ہے وہیں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے جذبہ عشق ومحبت کا شاندار نمونہ بھی پیش کیا ہے۔اسلام کے خلاف تھوپی ہوئی موجودہ جنگوں کو حقائق کی روشنی میں دیکھنا ہو تو موجودہ صلیبی صہیونی جنگ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔اسی طرح

انھوں نے عالم اسلام کی حالت زار پر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو پستیوں اور مایوسیوں کے گہرے غار سے نکالنے کی بھی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے لیے ایک عمدہ پیش کش ''کیا اسلام پسپا ہورہا ہے؟'' ہے جس میں مولانا امینی نے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد کا سبق دہرا کر ایک طرف اہل اسلام کو ہمت وحوصلہ دلایا تو دوسری طرف دشمنان اسلام کو چیلنج بھی۔ ربع صدی پر محیط ارض مقدس فلسطین کی سرخ تاریخ کی سرگزشت کے لیے فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں رقم کر کے ایک بار پھر نور عالم نے اپنے نور کو عالم میں پھیلایا ہے اور مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کا سراغ دیا ہے۔کاش! مولانا کے قلم کی شعاع آفتابِ صبح بن کر عربوں کی بیداری کا سامان فراہم کرسکے اوران کے قلم کی سیاہی فلسطینیوں کے زخموں کا مرہم بن سکے۔

اس کے علاوہ مولانا امینی کی عربی زبان میں متعدد شاہکار کتابیں، درجنوں کتابوں کے تراجم اور سیکڑوں وقیع مقالات ان کی علمی اورفنی قابلیت کی شہادت دیتے ہیں۔مولانا امینی کی ادبی تجلیوں اور افکار کے بہت سے خوب صورت پھول بے شمار رسائل واخبارات کی کیاریوں میں بھی کھلے اور کھل رہے ہیں۔ان پھولوں نے اپنی علمی، ادبی اور فکری خوشبو بکھیری اور بکھیر رہے ہیں اور اہل ذوق کے ذہن ودماغ کو تازگی بخش رہے ہیں۔

مولانا نور عالم کے قلم کی روانی، لہجے کی شگفتگی اور فکر کی بالیدگی سے ایک ایسا دلکش گلدستہ تیار ہوا ہے جس کے پھول نوع بہ نوع، جس کی پنکھڑیاں رنگ بہ رنگ اور جس کی مہک شہر بہ شہر ہے لیکن سب کچھ کے باوجود مولانا امینی کا عربی ادب سے حددرجے کا شغف اوراس زبان سے عشق کے درجے کا لگاؤ دیگر چیزوں سے انھیں ممتاز اور فائق کردیتا ہے اور صحیح معنوں میں یہی ان کا طرۂ امتیاز بھی ہے جس کی شہادت ان کی ادارت میں نکلنے والا عربی ماہنامہ ''الداعی'' کے لفظ لفظ سے ملتی ہے بطور خاص اس کا ایک کالم ''اشراقۃ'' کا حرف حرف ادب کے لعل وگہر سے بھرپور نظر آتا ہے۔مولانا امینی کی زیرِ ادارت، چالیس سال کے عرصے سے نکلنے والا یہ ماہنامہ، ماہنامہ کیا چشمہ ادب کہہ لیجیے کہ یہ اہل ادب اور صاحب ذوق کی سیرابی کا کام انجام دے رہا ہے۔آج مولانا نور عالم کو ملک اور بیرون ملک میں جو شہرت اور مقبولیت ملی ہے، اسے بلاشبہ اسی مبارک، آفاقی اور دائمی زبان کا نتیجہ کہا جائے گا۔خدا ہمیں بھی کامراں اور کامرانی سے پہلے اس کے لیے عملی جدوجہد کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

❁ ❁ ❁

مولاناؒ کی کتاب
''کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے؟''
(ایک تجزیہ)

از: مولانا عمر فاروق قاسمی

مولانا نور عالم خلیل امینیؒ بیک وقت اردو اور عربی دونوں زبانوں پر فنی مہارت رکھتے ہیں، اپنے منفرد اسلوب اور لازوال طرز تحریر کی بنیاد پر وہ دونوں حلقوں میں مقبول اور معروف ہیں۔ اسلامی دنیا کے خلاف صلیبی وصہیونی سازشوں کی نقاب کشائی اور مغرب کی مکاری کا پردہ چاک کرنا ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ وہ عالم اسلام کی سیاسی، سماجی اور فکری صورت حال پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عالم اسلام کے حوالے سے ان کی جتنی بھی تحریریں ہیں، اپنے دل کش اسلوب اور گہربار طرز تحریر کی وجہ کر، تارِ دل کو چھیڑتے ہوئے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ جہانِ اسلامی کے معاصر مسائل کو ہر دو زبانوں میں انھوں نے جس انداز میں پیش کیا ہے، وہ ذہنوں کو جھنجھوڑتے اور ضمیروں کو بیدار کرتے ہیں، اس حوالے سے وہ بے لاگ تبصرے اور تجزیئے بھی کرتے ہیں۔ اردو زبان وادب کے معروف نقاد حقانی القاسمی اس ضمن میں اپنی کتاب ''دارالعلوم دیوبند—ادبی شناخت نامہ'' میں لکھتے ہیں:

''مسلم دنیا کے تعلق سے جو مثبت اور عمدہ تجزیئے فضلائے دیوبند نے لکھے ہیں وہ عالم اسلام پر لکھنے والے نام نہاد، سیاسی مبصروں اور تجزیہ نگاروں کے مضمحل مضامین کے مقابلے میں زیادہ معنی خیز، فکر انگیز اور مبنی برحقائق ہوتے ہیں۔ اس تعلق سے مولانا نور عالم خلیل الامینی کا ذکر بطور خاص کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مشرق وسطی اور مسلم دنیا کے مسائل پر جو سیاسی تجزیئے کیے ہیں وہ طرز احساس اور اظہار کے اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہیں۔ ان کے تجزیئے عمدہ اور مبنی برحقیقت ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں حقائق کی عکاسی ہی نہیں؛ بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے بیداری کا پیغام بھی ہوتا

ہے۔ان کی تحریریں ذہن کو جھنجھوڑتی ہیں اور ضمیر کو بیدار کرتی ہیں۔'' (حقانی القاسمی، دارالعلوم دیوبند ادبی شناخت نامہ ص۹۲، ناشر: آل انڈیا تنظیم علمائے حق ۲۵ کیوالصمد روڈ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

اس حوالے سے تو ان کے مضامین کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، جیسے ''فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں، عالم اسلام کے خلاف موجودہ صلیبی صہیونی جنگ اور کیا اسلام پسپا ہورہا ہے؟'' سردست میرے زیر مطالعہ یہی مؤخرالذکر مجموعہ ہے۔

اس کتاب کے کل ۲۱۹ صفحات ہیں۔ یہ کتاب ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو وقتاً فوقتاً ہندوستان وپاکستان، سعودی عرب، مصر وغیرہ کے اردو وعربی اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ خیر وشر کی معرکہ آرائی جیت آخر کس کی ہوگی؟، اتحاد واشتراک، ہماری تمام مشکلوں کے حل کی شاہ کلید، عراق میں شکست؛ مگر کس کی؟، فتح وشکست اور قانون الٰہی، ہاں سنو اللہ کی مدد آیا چاہتی ہے، فکری یلغار: مسلمانوں کو مذہب بیزار کرنے کی ہمہ گیر سازش کا حصہ، ظالموں کا ظلم بھی خدا کے وجود کی گواہی دیتا ہے، وقت کے فتنے اور راہ صواب، حالات حاضرہ اور حضور ﷺ کی تعلیمات، اہانت آمیز کارٹون اور مغرب کا رویہ، حق کے خلاف باطل کی دیرینہ فتنہ سامانی، اسلام مسلمانوں کے خلاف دشمنانِ وقت کی طرف سے محاذوں کی تکثیر اور اسوۂ نبی اکرم ﷺ وغیرہ عناوین پر انھوں نے مسلمانوں کے عالمی مسائل پر بڑی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ پوری دنیا میں مسلمانوں نے عراق وافغانستان میں امریکہ کی ناکامی اور مسلمانوں کی فتح مندی کی دعائیں مانگی؛ لیکن بہ ظاہر ان کی دعائیں قبول نہیں ہوئیں، جس کی وجہ کر مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ اللہ رب العزت نے موجودہ زمانے میں مظلوموں کی مدد اور ظالموں کی سرکوبی کی سنت سے منہ موڑ لیا ہے اور یہ طے کرلیا ہے کہ مادیت ووسائل سے مالا مال کافر وفاجر ہی اس دنیا کے مالک ہوں گے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر یقین رکھنے والے مسلمانوں کو اس دنیا سے بے دخل کردیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اسی خلجان کو دور کیا گیا ہے؛ چناں چہ مولانا امینی اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے مضامین میں عام مسلمانوں کے اسی خلجان کے علاج کی دوا فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ حاضر کی موجودہ صورتِ حال، ماضی میں نہ صرف عام مسلمانوں کو؛ بل کہ خود نبی اعظم محمد ﷺ کو بھی پیش آچکی ہے۔ آپ کے کردار وعمل اور قول وفعل میں اس سے نمٹنے کا کامیاب تجربہ ونمونہ موجود ہے، ہم مسلمانوں کو زندگی کے سارے ان گنت مسائل کی طرح صلح وجنگ اور دوست ودشمن سے مقابلے کے تعلق سے بھی آپ ﷺ ہی کے اسوۂ حسنہ کو

اپنانا ہے۔ آپ ﷺ کو، آپؐ کے ساتھیوں کواور آپؐ کے ساتھیوں کے دیکھنے والوں کواوران کے بعد کی ساری نسلوں کو، ہمیشہ حالات کی دھوپ چھاؤں سے اسی لیے گزارا گیا تھا؛ تاکہ بعد کی نسلوں کوان کے حال وقال کی روشنی میں راہِ عمل تلاش کرنے میں آسانی ہو۔ نقشۂ عمل اور زندگی کا روزنامچہ، اللہ کے آخری اور پایندہ دین میں آیندہ مسلمانوں کے لیے بھی وہی رہے گا، جو ماضی کے مسلمانوں کے لیے رہا ہے۔ اگر انھوں نے اپنے وقت کے نمرود کی آتشِ فروزاں سے بچنے کی راہ ڈھونڈلی تھی اور صبر و توکل اور جہد وعمل کے ذریعہ اس کو''گل زار'' میں تبدیل کرلیا تھا، تو آج کے مسلمانوں کو بھی نمرودانِ وقت کی آتشِ تیز وتند سے بھی اسی طرح نمٹنا ہوگا''۔ (مولانا نور عالم خلیل امینی، کیا اسلام پسپا ہورہا ہے؟ ص۱۳ ناشر: ادارہ علم وادب افریقی منزل قدیم دیوبند یوپی انڈیا، اشاعت مارچ، اپریل ۲۰۱۵، جمادی الاخری۱۴۳۶، تیسرا اڈیشن)

عالم اسلام کا سمت سفر متعین کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ضروری ہے کہ ہم ہمیشہ حق کے متلاشی رہیں باطل خواہ کتنا بھی سر چڑھ کر بولے، پیچ وتاب کھائے، شیر کی طرح گرجے، چیتے کی طرح چنگھاڑے، خوف ووحشت کا ماحول پیدا کرے، سائنس اور ہتھیاروں سے لیس ہو، زمان ومکان ہم پر مصائب کی بارش برسائیں، پیمانہ الٹ پلٹ جائے، باطل حق اور حق باطل کا روپ دھار لے، دوست دشمن بن جائے، قریب دور ہوجائے اور آشنا ناآشنائی کا مظاہرہ کرے اور اپنے بے گانے بن جائیں؛ آپ ﷺ نے اپنے تمام مواقف میں ہمارے لیے شان دار اور قابلِ تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔'' (حوالہ سابق ص ۲۰۸)

اس کتاب میں کل بارہ مضامین شامل ہیں۔ تین مضامین براہ راست اردو میں لکھے گئے، بقیہ نو مضامین عربی میں لکھے گئے اور ماہنامہ الداعی میں شائع ہونے کے بعد ان میں سے سات مضامین کا ترجمہ مصنف کے خود اپنے قلم سے ہوا ہے۔ دو مضمون کا ترجمہ ڈاکٹر ابراراحمد اجراوی نے کیا ہے۔ اس کتاب کی زبان بھی مصنف کی دگر تحریروں کی طرح کوثر وتسنیم سے دھلی ہوئی ہے اور اردو ادب کی الماریوں میں چار چاند لگاسکتی ہے۔ کتاب کے مصنف خود لکھتے ہیں:

''یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف قارئین کی مذکورہ الجھنیں کافور ہوں گی؛ بل کہ موجودہ حالات اور آیندہ پیش آنے والے ان جیسے حالات سے ایمان وعقیدے کی پختگی کا سامان مُیَسّر آئے گا۔ تعبیر کی لذت، اندازِ تکلم کی بہت سی جگہ ندرت اور تلمیحات واستعارات کی نفاست سے باذوق قاری کو دل کی غذا، روح کی شفا، یقین کی روشنی اور خیالات کی صیقل گری کی تدبیر بھی ہم دست

ہوگی؛ کیوں کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ روح کے تقاضے، غیرت ایمانی کی طلب اور جذبہ دل کی تڑپ کی وجہ سے ہی لکھا گیا ہے؛ اس لیے خدائے علیم وخبیر نے اس حرف ناتواں کو اپنی قدرت سے غیر معمولی جاذبیت سے نوازا ہے۔ یہ مضامین عربی سے بہ قلم مضمون نگار اردو میں ترجمہ ہوکر، اپنے وقت پر شائع ہوئے اور شوق وجذبے کے ساتھ پڑھے گئے۔ توقع ہے کہ کتابی شکل میں یہ زیادہ لائق پذیرائی ثابت ہوں گے؛ کیوں کہ اب یہ مربوط ومسلسل صورت میں زیادہ مفید ہوگئے ہیں۔'' (حوالہ سابق ص ۱۴ حرف پیشیں)

مولانا کی تحریروں میں خوف وڈر، پستی وہمت شکنی نہیں، وہ امت مسلمہ کی پسماندگی، زبوں حالی اور کمزوریوں کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں لیکن بلند ہمتی کے ساتھ۔ ان کی سطر سطر میں عزم وحوصلہ کا پیغام موجود ہے، ان کے یہاں رونا دھونا اور نوحہ گری کی جگہ عظمت رفتہ کی بازیافت کے امکان کی تلاش ہے۔ وہ حالات کے تحت بامقصد پس روی کو بھی پیش رفتی کا ذریعہ مانتے ہیں؛ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''امت مسلمہ کا سورج بالکلیہ غروب ہوجائے، ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ زخم کھاکے پھر مسکرائی ہے، کچل جانے کے بعد پھر اٹھ کھڑی ہوئی ہے، اس کا جھنڈا اگر کبھی ذرا سا جھکتا ہوا نظر آیا، تو پھر بلندی پر پھہرانے لگا، وہ اگر پیچھے ہٹی ہے، تو مزید تازہ دم ہوکر آگے بڑھی ہے۔ وہ خدا کے آخری پیغام کی نمایندہ ہے؛ اس لیے اسی کی طرح جاوداں ہے۔'' (حوالہ سابق ص ۹۱)

مولانا امینی نے عالم اسلام پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں مغرب بالخصوص امریکہ کی مکاری، فریب، دوغلا پن اور عالم اسلام کے حوالے سے اس کے دوہرے رویہ کو اجاگر کیا ہے اور دنیا کے سامنے امریکہ اور اقوام متحدہ کی منافقت پر کھل کر بحث کی ہے۔ حقانی القاسمی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' مولانا امینی نے مغرب کی مکاری اور عیاری کا پردہ چاک کیا ہے اور اپنے مضامین کے ذریعے صحیح صورت حال دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ ہر لحہ آتش نمرود میں کودنے والے مسلمان کی وہ تصویر دکھائی ہے، جو حقیقی ہے، معشوق کی موہوم کمر کی طرح خیالی نہیں کہ خیالی تصویر جو مغرب نے بنائی، وہ کذب وریا، بغض وعداوت پر مبنی ہے۔'' (حقانی القاسمی ہفت روزہ عالمی سہارا، ۲۳ جون ۲۰۰۷ ص ۲۰)

البتہ حقانی القاسمی نے یہ بھی لکھا کہ مولانا کے بعض خیالات سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود مولانا نے اتحاد واتفاق کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے اس سے انکار نہیں:

''مولانا کے بعض خیالات سے اختلاف بھی ممکن ہے جو ان کے مخصوص دینی نظام کی زائیدہ ہیں، بالخصوص جمال عبدالناصر اور صدام حسین کے متعلق ان کی منفی رائے جمہور کے لیے ناقابل قبول ہوسکتی ہے؛ مگر ان کے اس خیال سے ہر کوئی اتفاق کرے گا کہ ہم صرف اتحاد کے ہتھیار سے پوری دنیا پر چھا سکتے ہیں اور بڑی سے بڑی طاقت سے لوہا لے سکتے ہیں؛ اسی لیے دشمنان اسلام ہمیشہ ہمیں آپس میں دست و گریباں بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔'' (حوالہ سابق)

اس جزوی اختلاف کے باوجود وہ کتاب کی افادیت کے معترف ہیں چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''معاصر عالمی سیاسی صورت حال کی تفہیم میں یہ مضامین بہت مفید ثابت ہوں گے۔ خاص طور پر خرمن کے خوشہ چینوں کے لیے ان مضامین میں بہت کچھ ہے، جن سے وہ اپنے صحافتی سفر میں فکر و نظر کے نئے چراغ جلاسکتے ہیں۔'' (حوالہ سابق)

کتاب کے اسلوب نگارش کا انھوں نے بہت خوبصورت اور والہانہ انداز میں استقبال کیا ہے:

''مولانا نور عالم خلیل امینی عالم اسلام کی مجموعی صورت حال سے باخبر ہیں اور امت اسلامیہ کی زبوں حالی پر فکر مند بھی۔ ان مضامین میں نور عالم امینی کا انداز فکر اور انداز نظر نمایاں ہے۔ گو کہ یہ مضامین عصری، سیاسی مسائل سے متعلق ہیں؛ مگر یہ عوامی یا عامیانہ نہیں ہیں۔ ممتاز محقق رشید حسن خان مرحوم نے مولانا آزاد کے تعلق سے بہت اچھی بات لکھی تھی کہ ''مولانا آزاد کا انداز نظر صحافیانہ نہیں تھا اور اسی چیز نے ان کی تحریروں کو دوامی اعتبار عطا کیا ہے''۔ نور عالم خلیل امینی کے تعلق سے بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ ان پر باطن ایام روشن ہے؛ اس لیے ان کے سیاسی تجزیئے بھی عمدہ اور بہترین ہیں۔ طرزِ احساس اور طرزِ اظہار کے اعتبار سے منفرد وممتاز۔

مشرق وسطی کی سیاسی، سماجی، ثقافتی صورتِ حال سے براہ راست، بغیر کسی وسیلہ کے آگاہ ہیں؛ اسی لیے ان کا تجزیاتی انداز بھی الگ ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ اور متعصّبانہ تجزیوں پر مبنی مضامین سے مختلف ہیں۔ یہ تجزیئے ان کے گہربار اسلوب کی وجہ سے دامن دل کو کھینچتے ہیں۔

مولانا کا اسلوب بھی نرالا ہے۔ آنکھیں لفظوں کو جذبے کی جس شدت سے چھوتی ہیں، اسی قوت سے لفظ قندیل کی طرح ذہن میں روشن ہوئے جاتے ہیں۔'' (حوالہ سابق)

مولانا نور عالم صاحب کا اسلوب طرز تحریر کے البیلا پن، انداز بیان کی ندرت، جملوں کی حسنِ ترتیب، الفاظ کی ساخت و بناوٹ، دل کش پیرایۂ بیان کی بنیاد پر اپنے ہم عصروں میں ممتاز رہا ہے۔ ان کی یہ خوبیاں اس کتاب کے اندر بھی سطر سطر میں نمایاں ہے۔ اس کتاب کے انداز بیان اور طرز

تحریر پر روشنی ڈالتے ہوئے مفتی تنظیم عالم قاسمی لکھتے ہیں:

''تحریر کے رموز ونکات اور اصول وقواعد کی بھرپور رعایت، جملوں کی حسن ترتیب، لہرآفریں تعبیر، انداز تکلم کی ندرت، تلمیحات واستعارات کی نفاست اور اس طرح کی دوسری درجنوں خوبیاں اس میں موجود ہیں، جن سے کتاب کی اہمیت اور قدر ومنزلت غیر معمولی ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب نہ صرف موجودہ حالات، مسائل ومشکلات کا حل اور غیرت ایمانی کو ابھارنے والی ہے، بلکہ اردو زبان کے باذوق قاریوں، ادبا، اور ماہرین فن کو روحانی غذا اور تسکین قلب کا سامان بھی فراہم کرتی ہے،'' (مفتی تنظیم عالم قاسمی، روزنامہ منصف حیدرآباد)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے تمام مشمولات اور انداز نگارش کی بنیاد پر لائق مطالعہ ہے، اس کے مطالعہ سے جہاں عالم اسلامی کے حوالے سے نمرودانِ وقت اور فراعنۂ زماں کی سازشوں اور اس کے سدباب کے طریقوں سے آگاہی ہوتی ہے، وہیں اپنے اسلوب اور انداز نگارش کی بنیاد پر صحافت اور ادب کے طالب علموں کے لیے دلچسپی کا سامان بھی فراہم کرتی ہے۔

❁ ❁ ❁